میری سب سے پیاری بیٹی

ذوالفقار علی بھٹو

(بے نظیر بھٹو کے نام آخری خط)

Reproduced by
Sani Hussain Panhwar
Member Sindh Council, PPP

ذُوالفقار علی بُھٹّو

(بے نظیر بھٹو کے نام آخری خط)

پیش لفظ

یہ امر میرے لئے عزت افزائی کا باعث ہے کہ مجھ سے اس خط کا پیش لفظ لکھنے کیلئے کہا گیا ہے ۔ جس کو پاکستان کے سابق صدر اور وزیراعظم مرحوم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی سب سے پیاری بیٹی بےنظیر کو راولپنڈی جیل کی کوٹھری سے لکھا تھا۔ جو کام میرے سپرد کیا گیا ہے وہ بہت زیادہ تکلیف دہ ہے۔ لاہور ہائی کورٹ نے ایک غیر معروف سیاسی مخالف کو قتل کرانے کی سازش کے الزام میں جناب بھٹو کو موت کی سزا کا حکم دیا تھا۔ اس سزائے موت کے حکم کے خلاف سپریم کورٹ آف پاکستان میں جو اپیل دائر کی گئی تھی اس کی پیروی کیلئے انہوں نے مجھے وکیل صفائی مقرر کیا تھا۔

میں اپنے انتہائی ممتاز موکل کو بچانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ میرے پاس اہل اور مخلص وکلاء کی پوری ٹیم تھی جنہوں نے ان کی زندگی بچانے کی کوشش میں میری مدد

 Copyright © www.bhutto.org

کی۔اس عمل کے دوران ٹیم کے ایک رکن غلام علی میمن جو میرے دوست بھی تھے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اس لئے کہ وہ اس جان لیوا تجربہ کو برداشت نہیں کر سکے جس سے ہم تقریباً ایک سال سے گزر رہے تھے یعنی مارچ ۱۹۷۸ء سے مارچ ۱۹۷۹ء تک کے عرصہ میں گزر رہے تھے۔ چیف جسٹس جو سپریم کورٹ میں اس اپیل کی سماعت کر رہے تھے۔استغاثہ کی جانب سے دلائل دیتے تھے اور عدالت کی طرف سے سزائے موت کو زیادہ پرجوش انداز میں حق بجانب قرار دیتے تھے بمقابلہ اس وکیل استغاثہ کے جس کو بار سے مقرر کیا گیا تھا۔ یہ بات سپریم کورٹ کی روزمرہ کی کارروائی سے جس کو ریکارڈ کیا جاتا تھا ظاہر تھی۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی سزائے موت پر عملدرآمد کے فوراً بعد ان کو تختہ دار پر چڑھانے والوں اور ان کے حواریوں کی جانب سے ایک مہم کا آغاز کیا گیا جواب بھی جاری ہے کہ ان کا دفاع صحیح طور پر نہیں کیا گیا یا یہ کہ اپیل کے سلسلہ میں جو دلائل دیئے گئے وہ غلط خطوط پر دیئے گئے ورنہ وہ سزائے موت سے بچ جاتے۔ ایسا یہ ثابت کرنے کیلئے کیا گیا کہ جنرل ضیاءالحق اور اس سلسلہ میں ان کے ساتھ ساز باز کرنے والوں نے بھٹو کو جسمانی طور پر ختم کر دینے کی سازش نہیں کی تھی تاکہ جنرل کی حکومت کو دوام حاصل ہو سکے۔اپیل کا فیصلہ جو ججوں کی اکثریت اور ان کی اقلیت نے دیا تھا شائع ہو چکا ہے اور مقدمہ کی کارروائی کے دوران جو دلائل پیش کئے گئے تھے وہ بھی دستیاب ہیں اس لئے کہ ان کو بھی ریکارڈ کیا جاتا تھا۔ وہ لوگ خصوصاً قانون دان جو ان دلائل کو پڑھنے کی زحمت گوارہ کریں وہ یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آیا کیس صحیح طور پر پیش کیا گیا تھا یا نہیں۔

غیر جانبدار مبصرین نے جنہوں نے اس مقدمہ کا مطالعہ کیا مسٹر بھٹو کے خلاف

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

الزامات کی نوعیت اور شہادت پر اور مقدمہ کے طریقۂ کار پر جس کو انہیں مجبوراً برداشت کرنا پڑا تبصرہ کیا ہے۔ امریکہ کے سابق اٹارنی جنرل مسٹر ریمسے کلارک نے جو پاکستان میں کئی روز تک ذاتی طور پر اپیل کی سماعت کے دوران عدالت میں موجود رہے ۱۴ فروری ۱۹۷۹ء کو نیو یارک ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ مسٹر بھٹو کے ساتھ ناانصافی ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ دونوں ہی میں ہوئی اور یہ کہ ان کے خلاف شہادت کی بنیاد پر وہ مجرم نہیں مانے جا سکتے تھے۔ نو ججوں پر مشتمل عدالت نے اپیل کی سماعت شروع کی لیکن نامعلوم وجوہات کی بناء پر دو جج موجود نہیں تھے جب سزائے موت کی توثیق تین ججوں کے فیصلہ کے خلاف چار ججوں نے کی۔ مسٹر ریمسے کلارک نے کہا کہ ''اس طرح ایک ممکنہ پانچ۔ چار کا منقسم فیصلہ جو بری اور رہا کر دینے کے حق میں ہوتا چار۔ تین کے فیصلے میں تبدیل کر دیا گیا جو سزائے موت کے حق میں تھا۔''

ہائی کورٹ کی جانب سے سزائے موت کا حکم سنائے جانے کے بعد اکونامسٹ لندن نے اپنے ۲۵ مارچ ۱۹۷۸ء کے شمارے میں لکھا تھا کہ ''چیف جسٹس جس نے اس مقدمہ کی سماعت کی وہ ذاتی طور پر مسٹر بھٹو کا مخالف تھا۔ پریس نے جو حکومت کے کنٹرول میں تھا فضا کو مسموم کر دیا جس میں پانچ ججوں نے اس شہادت پر غور کیا جس میں مسٹر بھٹو کے کردار اور ریکارڈ پر متواتر حملے کئے گئے تھے۔ مقدمہ کی نصف سماعت تو بند کمرہ میں ہوئی۔''

''شہادت کی نوعیت انتہائی قابل اعتراض تھی۔ استغاثہ کے گواہ مشکوک حیثیت کے تھے لیکن جو کام فوجیوں نے (جنہوں نے ۵ جولائی کے فوجی انقلاب کے بعد پاکستان پر حکومت کی ہے) پانچ ججوں کے لئے مقرر کیا تھا وہ بالکل واضح تھا کہ مسٹر

بھٹو کو سیاسی منظر سے ہٹانا ہے۔''

کوپن ہیگن کے پروفیسر ایف سی کرون نے جنہوں نے پاکستان میں مسٹر بھٹو کے مقدمہ کی کارروائی کو دیکھا تھا ۵ جولائی ۱۹۷۸ء کو ایشیاء ویک میں تحریر کیا تھا کہ ''ذوالفقار علی بھٹو کے مقدمہ کو کسی بھی معیار سے منصفانہ نہیں کہا جا سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فوجی انقلاب برپا کرنے والے جنرل مسٹر بھٹو کی موت یا قانونی قتل کو اور ایک خطرناک سیاسی مخالف کو ختم کر دینے کو ایک منطقی ضرورت سمجھتے ہیں۔ مقدمہ کی سازش اس وقت کی گئی جب فوجی انقلاب کے دو مہینے بعد یہ بات واضح ہوگئی کہ مسٹر بھٹو مجوزہ عام انتخابات میں جیت جائیں گے۔''

نیو یارک کے وکلاء کی کمیٹی برائے بین الاقوامی انسانی حقوق نے پاکستان میں انسانی حقوق کی پامالی پر اپنی رپورٹ میں میرے وکیل صفائی کی حیثیت سے اپیل کی سماعت کے دوران تنگ کئے جانے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا تھا کہ ''مسٹر بختیار نے مسٹر بھٹو کی سزائے موت کے خلاف دائر کردہ اپیل کی سرگرمی سے پیروی کی۔ وہ تقریباً کامیاب ہو گئے تھے۔ نو ججوں میں سے چار ججوں نے سزائے موت کو برقرار رکھا۔ تین ججوں نے سزائے موت دیئے جانے کی مخالفت کی اور دو ججوں کو اپیل کی کارروائی سے علیحدہ ہو جانے کیلئے مجبور کیا گیا۔''

اسی قسم کی بے شمار آراء میں سے ان چند آراء کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا ہے کہ میں وزیراعظم کی اپیل کے سلسلے میں اپنے طریقۂ کار کا دفاع کرنا چاہتا ہوں بلکہ ان افراد کو جو حقائق سے ناواقف ہیں یہ بتانے کیلئے کیا گیا ہے کہ کس قدر ناانصافی وزیراعظم کے ساتھ روا رکھی گئی تھی۔ مجھے شہادت کی بنیاد پر اور مسٹر بھٹو سے ذاتی طور

Copyright © www.bhutto.org

پر واقف ہونے کی بنیاد پر یقین تھا کہ وہ بے قصور ہیں اور یہ کہ مبینہ قتل کی سازش سے ان کا قطعی کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب سزائے موت کا حکم سننے کے بعد انہوں نے مجھے جیل سے مندرجہ ذیل الفاظ لکھے تو مجھے ان کی بات پر یقین کرنے میں ذرا بھی شک اور تذبذب نہیں ہوا۔

''میں نے اس شخص کو قتل نہیں کرایا۔ میرے اللہ کو اس کا علم ہے اگر میں نے ایسا کیا ہوتا تو میں اس قدر عظیم ضرور ہوں کہ اس بات کو تسلیم کر لیتا۔ یہ تسلیم کر لینا اس وحشیانہ مقدمہ کے مقابلہ میں جس کو کوئی خود دار انسان برداشت نہیں کر سکتا، کہیں کم ذلت کا باعث ہوتا۔ میں ایک مسلمان ہوں۔ ایک مسلمان کی قسمت اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں میں ہے۔ میں صاف ضمیر کے ساتھ اس کے سامنے پیش ہو سکتا ہوں اور اس سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اسلامی جمہوریۂ پاکستان کی از سرِ نو تعمیر کی جبکہ وہ ایک راکھ کا ڈھیر تھا اور اسے محترم قوم بنا دیا۔ کوٹ لکھپت کی اس کال کوٹھری میں میرا ضمیر پر سکون ہے۔ میں موت سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ میں کس کس آگ میں سے ہو کر گزر ا ہوں۔''

جی ہاں۔ میں ان تکالیف و مصائب کا گواہ ہوں جو انہیں برداشت کرنی پڑیں۔ وہ ایک وحشیانہ طرز کے مقدمہ سے ہو کر گزرے۔ جیل میں قابل افسوس سلوک ان کے ساتھ کیا گیا۔ وہ ایک عظیم اور فراخدل انسان تھے۔ انہیں اپنی عزت کا گہرا احساس تھا اور اس پر فخر تھا۔ وہ ایک سابق سربراہ مملکت اور پاکستان کے منتخب وزیراعظم تھے۔ ان کے ساتھ ان لوگوں نے برا سلوک کیا جو چھوٹی چھوٹی مہربانیوں کیلئے ان کی خوشامدیں کیا کرتے تھے۔ اسی سبب سے اس پیش لفظ کا لکھنا ایک تکلیف دہ کام ہے۔ اگر مطلبی اور اقتدار کا بھوکا ٹولہ انہیں سیاسی منظر سے بالکل ہٹا

Copyright © www.bhutto.org

دینا چاہتا تھا تو وہ ایسا فوجی انقلاب والی رات کو ہی کر سکتا تھا۔ایسا کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی۔جیسا کہ انہوں نے خود بھی اس خط میں افغانستان کے صدر داؤد کے قتل کا حوالہ دیا ہے اور کہا ہے کہ ''ایسا انقلابی جنگ کے دوران ہوا۔ایسا کرنا اس لمحہ کی منطق کے مطابق تھا۔اس قتل کی منصوبہ بندی پہلے سے نہیں کی گئی تھی۔وہ کوئی بے رحمانہ اور سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت عدالتی قتل نہیں تھا جس کا میں شکار بنایا گیا ہوں۔جو کچھ وقتی اشتعال کے طور پر کیا جاتا ہے اور جو کچھ ایک گھناؤنی سازش کے ساتھ جو مہینوں چلتی رہے کیا جاتا ہے ان کے درمیان بہت فرق ہوا کرتا ہے۔''

لیکن میں اب بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ظلم پسند حکومت نے انہیں ''قتل'' کرنے سے پیشتر اس قدر تکلیف واذیت کیوں دی اور ان کی اس قدر تذلیل کیوں کی؟ وہ لوگ کیوں اس قدر منتقم المزاج ہو گئے تھے اور کیوں اس قدر سفلہ پن پر اتر آئے تھے؟

انہوں نے غالباً اس سوال کا جواب بھی دیا ہے جب انہوں نے اس خط میں کہا ہے کہ'' تاہم اس قسم کے دقیانوسی انتقام کا کیا مقصد ہے؟اس معاملہ میں اس انتقام کی وجہ مطلب پرستی اور خود غرضی ہے۔ یہ حکمراں ٹولہ کے فائدہ کیلئے ہے نہ کہ ملک کے عوام کے فائدہ کے لئے ہے۔اگر عوام میرا سر چاہتے تو میں بغیر کسی حیل وحجت کے اپنا سر جھکا دیتا۔اگر میں عوام کے اعتماد واحترام سے محروم ہو گیا تھا تو میں زندہ رہنا پسند نہیں کرتا۔ڈرامہ کا المیہ یہ ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔''

خط میں کسی اور جگہ انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ''۱۹۷۰ء میں پنجاب کے ہر گاؤں میں گیا اور اس حکمراں ٹولہ کے غبارہ میں سے ہوا نکال دی۔میں

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

پنجاب کا اسی طرح غیر متنازعہ لیڈر ہوں جس طرح کہ باقی ملک کا مصدقہ لیڈر ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ٹولہ مجھ سے نفرت وحقارت سے پیش آتا ہے۔ میں نے ان کے ہی گھر میں ان کی قلعی کھول دی۔ میں نے پنجاب کے عوام کو ان لوگوں کو گردن سے پکڑنے کے لئے تیار کیا۔''

''اس فوجی جنتا نے اپنے پی این اے کے دوستوں کو بھی دھوکہ دیا ہے۔ ان کو استعمال کیا گیا اور ان کا استحصال کیا گیا کہ وہ فوجی حکومت کو دوام بخشیں اور مجھ سے نجات حاصل کرنے کیلئے حکومت کی کوششوں کو آسان بنائیں۔''

وہ ایک انسان تھے اور تمام انسانوں کی طرح ان میں بھی کمزوریاں تھیں لیکن وہ استثنائی طور پر ایک ذہین سیاستدان تھے اور انتہائی جرأت مند انسان تھے۔ سب سے بڑھ کر وہ ایک محبّ وطن تھے جن کو اپنے ملک سے محبت تھی۔ وہ ملک ہی کیلئے زندہ رہے اور ملک کیلئے ہی انہوں نے ایک شہید کے طور پر جان دی۔ جب فوجی جنتا نے ۱۹۷۱ء میں ملک کے ٹوٹنے کے بعد انہیں ملک سپرد کیا تو انہوں نے بچے کھچے پاکستان کی از سر نو تعمیر کیلئے اپنی تمام توانائیاں وقف کر دیں۔ اس لئے وہ اس موت کی کوٹھری میں اپنے ضمیر کی جانب سے مطمئن اور پر سکون تھے جیسا کہ انہوں نے بے نظیر سے کہا کہ ''میں نے تمام محاذوں پر بڑی سرگرمی سے نقل وحرکت کی۔ جس کام کی جانب میں نے پہلے توجہ مبذول کی وہ آئین سازی کا کام تھا تاکہ صوبائی خود مختاری کے پریشان کن سوال پر جمہوری اتفاق رائے ہو سکے۔ میں نے اقتصادیات کی از سر نو اصلاح کی۔ میں نے اہم سماجی اور اقتصادی اصلاحات کیں۔ میں نے بنگلہ دیش کے مسئلہ کو تسلیم کر کے اسے حل کیا۔ میں نے بھارت کے ساتھ شملہ معاہدہ کیا جس میں کوئی خفیہ شق نہیں رکھی اور سندھ اور پنجاب کا ۵ ہزار مربع میل سے زائد

Copyright © www.bhutto.org

علاقہ بھارت سے واپس لیا۔ میں نے ۹۰ ہزار جنگی قیدیوں کو رہا کرایا اور ایسا جنگی مقدمات کے بغیر کیا جس کا ان کو اندیشہ تھا۔ میں نے اسلامی سربراہی کانفرنس لاہور میں منعقد کی۔ میں نے امریکہ سے اسلحہ کی سپلائی پر عائد پابندی ختم کرائی۔ میں نے مسلح افواج کو جدید بنایا۔ میں نے ملک کو دوبارہ اس کے راستہ پر گامزن کر دیا۔ ملک کی یہ بحالی حیرت انگیز تھی۔ مجھے سب سے بڑا اطمینان اس بات سے حاصل ہوا کہ میں نے ملک کو جمہوری طریقوں سے ایسا آئین دیا جو تمام پارٹیوں کا متفقہ آئین ہے۔ ۱۹۷۳ء کا آئین پہلا متفقہ طور پر منظور شدہ آئین تھا جس کو پاکستان کی جمہوری اسمبلی نے منظور کیا تھا اور جس کا بنیادی ڈھانچہ اسلام، جمہوریت اور صوبائی خودمختاری پر مبنی تھا۔ یہ پاکستان کے چاروں صوبوں کے عوام کی آواز تھا جس کو ان کے منتخب لیڈروں نے ایک آئینی دستاویز کی شکل دے دی تھی۔"

تاہم ذوالفقار علی بھٹو کی منتخب حکومت کے برطرف کئے جانے کا ایک بنیادی سبب اور بھی تھا جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ کا معاہدہ تھا جو فرانس کے ساتھ کیا گیا تھا جس کو امریکہ کینسل (منسوخ) کرانا چاہتا تھا لیکن جس کو انہوں نے پاکستان کے مفاد میں منسوخ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ انہوں نے اس خط میں اشارتاً اور کنایتاً اس کا حوالہ دیا ہے اور بے نظیر کو ان مشکلات و خطرات سے متنبہ کیا ہے جس کا سامنا تیسری دنیا کے ایک خوددار اور محب وطن لیڈر کو کرنا پڑتا ہے۔ وہ بے نظیر سے کہتے ہیں کہ "مغرب کا طرفدار ہونا اور بھی خطرناک ہے۔ اگر قومی کاز کے دفاع میں اختلاف رائے کیا جاتا ہے تو سویلین فرمانروا کا فوجی انقلاب کے ذریعہ تختہ الٹ دیا جاتا ہے۔ اس کی جگہ ایک فوجی ڈکٹیٹر لے لیتا ہے جو کسی بارے میں بھی اختلاف رائے کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا خواہ اس کے ملک

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

کے اہم قومی مفاد کا معاملہ ہو۔''

اس خط میں مسٹر بھٹو نے اپنی موت کی کوٹھری سے دنیا کی سیاسی صورتحال کا طائرانہ جائزہ لیا ہے جوان کے خیال میں ۱۹۷۸ء میں پائی جاتی تھی۔ یہ خط ایک ایسے شخص کا تحریر کردہ ہے جس کی پرورش ایک شہزادے کی طرح ہوئی تھی۔ جس نے برکلے اور آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی تھی اور جس نے لنکن ان لندن سے وکالت کا آغاز کیا تھا یہ وہ شخص تھا جو برسوں تک ملک کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہا تھا۔ اس شخص کو اچانک ان لوگوں نے گھسیٹ لیا جن کیلئے اس نے بہت کچھ کیا تھا اور جن پر اس نے بہت زیادہ اعتماد کیا تھا جن میں جنگی قیدی بھی شامل تھے اور اسے ایک عام مجرم کی طرح جیل میں ڈال دیا گیا تھا اور اس کے ساتھ انتہائی افسوسناک سلوک کیا گیا تھا۔ ان کے لئے زندگی کو جس قدر بھی ممکن ہوسکتا تھا تکلیف دہ بنا دیا گیا تھا۔ اسے ایک تاریخ اور گندی کوٹھری میں رکھا گیا جس کی لمبائی ۹ فٹ اور چوڑائی ۶ فٹ تھی۔ اس کوٹھری میں ہر روز ۲۳ گھنٹے تک مقفل حالت میں ایک سال تک رکھا گیا تھا اور لوہے کی سلاخوں کے ذریعہ اس کی نگرانی ۲۴ گھنٹے کی جاتی تھی۔ بظاہر تو نگرانی کرنے والی چھ آنکھیں تھیں لیکن بیشمار خفیہ آنکھیں نگرانی پر مامور تھیں۔ دن بھر میں صرف ایک گھنٹہ کیلئے انہیں ایک چھوٹے سے اور گندے صحن میں لے جایا جاتا تھا تاکہ وہ گندی (نہ کہ تازہ) ہوا میں سانس لے۔ آسمان کو دیکھ سکے۔ اپنے وکیل سے مشورہ کر سکے۔ اپنے مقدمہ کے بارے میں ہدایات دے سکے اور اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ ہفتہ وار ملاقات کر سکے۔

موت کی سزا سنائے جانے کے بعد اور ناگفتہ بہ حالات میں رکھے جانے کے باوجود ذوالفقار علی بھٹو اپنا وقت صدر نکسن کی یادداشتوں اور دوسری کتابوں کے مطالعہ

میں صرف کیا کرتے تھے جو ان کو مل سکتی تھیں۔ ان کتابوں میں وہ ضخیم قرطاس ابیض بھی شامل ہے جس کو حکومت نے اپیل کی سماعت کے دوران شائع کرایا تھا تا کہ انہیں اور ان کی حکومت کو قطعی جھوٹے اور عناد پرستانہ الزامات کے ذریعہ بدنام کیا جا سکے اور ملک کے اندر اور ملک کے باہر ان کے خلاف متعصّبانہ رائے قائم کی جا سکے۔ وہ ان کتابوں کے حواشی پر اپنے نوٹ لکھا کرتے تھے۔ پھر وہ اپنے وکیل کے ساتھ پرسکون انداز میں ان نکات پر اپیل کی پیش رفت کے بارے میں کچھ سوالات کرنے کے بعد بات چیت کیا کرتے تھے۔ وہ بیرسٹر ایٹ لا تھے اور مقدمہ کی روزمرہ کی کارروائی کا مطالعہ سرکاری طور پر سپلائی کئے جانے والے اخبار کی رپورٹ سے کرتے تھے۔ انہیں اپنے انجام اور سزائے موت کے بارے میں قطعاً کوئی فکر نہیں تھی۔ میرا تو (ایک وکیل کی حیثیت سے) یہی یقین تھا کہ اس سزائے موت پر عملدرآمد نہیں ہوگا لیکن ان کا خیال تھا کہ اس پر عملدرآمد کیا جائے گا اور یہ بات وہ اکثر کہتے رہتے تھے۔ ان کی جرأت و ہمت پر سخت حیرت ہوتی تھی۔ ان کیلئے یہ بات کیسے ممکن تھی کہ وہ اپنی توجہ پاکستان کے مسائل سمیت ساری دنیا کے مسائل پر مبذول رکھتے تھے اور ہر مسئلے کے بارے میں اپنا غیر جانبدارانہ جائزہ پیش کر سکتے تھے جیسا کہ اس خط کے مطالعہ سے ظاہر ہے۔ بلاشبہ ان کا لہجہ کبھی تلخ ہو جاتا تھا اور کبھی جذباتی ہو جاتا تھا۔ تاہم ان کی تلخی کا زیادہ سبب وہ اقدامات تھے جو ان کے ملک اور اس کے عوام (جو ان سے محبت کرتے تھے) کے ساتھ کئے جا رہے تھے نہ کہ وہ سلوک تھا جو خود ان کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مایوسی اور دل شکستگی کی یہ وجہ تھی کہ انہیں تیسری دنیا کے لیڈر کی حیثیت سے اس کے غریب اور مظلوم عوام کا استحصال کرنے والوں سے ان کا حق دلانے کے موقع سے زبردستی محروم

 Copyright © www.bhutto.org

کیا جا رہا تھا۔ وہ اپنی بیٹی سے کہتے ہیں کہ ''نیا بین الاقوامی نظام تیسری دنیا کی سربراہ کانفرنس کے مطالبات کے ذریعہ ابھرے گا۔ شمال اور جنوب کے تنازعہ کا حل جو مشرق و مغرب کے تنازعہ کے مقابلہ میں زیادہ سنگین نوعیت کا ہے دیانتدارانہ طور پر اور غیر مشتبہ دیانتداری کے ساتھ تلاش کرنا ہے۔''

وہ مزید کہتے ہیں کہ ''افریقہ کے بارے میں مغربی رویہ کو تبدیل کئے جانے کی ضرورت ہے ''بدشکل کالے آدمی'' کے فخر اور احساس کو لازمی طور پر سمجھنا ہے۔ صرف زبانی ڈپلومیسی کارگر نہیں ہوگی۔ دونوں ہاتھوں سے افریقہ کی لوٹ بند ہو جانا چاہیئے۔ صرف اسی قدر رعایت کافی نہیں ہے کہ کسی منی بس میں کسی افریقی کے ساتھ بیٹھ جایا جائے۔ افریقہ تبدیل ہو گیا ہے اور وہ تبدیل ہوتا رہے گا۔ افریقی عوام حالانکہ وہ قبائلی اور پسماندہ ہیں اپنی شان کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کریں گے۔ ایشیاء کی صورتحال اسی طرح فروغ پذیر ہوئی۔ افریقہ کی صورتحال بھی اسی طرح فروغ پذیر ہوگی بلکہ زیادہ تیزی اور شدت کے ساتھ فروغ پذیر ہوگی۔''

وہ زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھنا چاہتے ہیں لیکن اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ وقت اس بات کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ وہ تختہ دار پر لٹکائے جانے کا انتظار کر رہے ہیں لیکن بے نظیر کو ہدایات بھی لازمی طور پر دینی ہیں۔

حالانکہ وہ اپنے تجزیہ کو غمگین خیال کرتے تھے جو تکلیف و پریشانی کے عالم میں کیا گیا ہے لیکن جیل کے ماحول نے ان کی غیر جانبداری کو متاثر نہیں کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''میں محض اس لئے کہ میں موت کی کوٹھری میں ہوں ساری دنیا کو موت کی کوٹھری میں نہیں دیکھتا ہوں۔''

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

ان کو اذیت پہنچانے والے ان کے عزم کو ختم کر دینا چاہتے تھے اور ان سے یہ امید کرتے تھے کہ وہ اپنی زندگی بچانے کی امید میں اپنی عزت اور اصولوں سے سمجھوتہ کرلیں۔ وہ اس میں ناکام رہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ وہ اس میں بری طرح ناکام رہے۔ انہوں نے ان کی جرأت اور عزت و وقار کے احساس کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ اخلاقیات اور انسانیت کے بارے میں ان کے جو تصورات تھے وہ ان لوگوں کی فہم سے ماورا تھے۔ وہ ان کو اپنے پست معیار سے جانچ رہے تھے۔ وہ لوگ ان کے عزم۔ ان کی پرامیدی۔ رومانوی رویہ اور مزاح کی حس کو ختم کرنے میں ناکام رہے جبکہ پھانسی کے تختہ سے وہ صرف چند قدم کے فاصلہ پر تھے۔ وہ اس خط کو یہ کہہ کر ختم کرتے ہیں کہ ''افریقہ پاگلوں سے نجات حاصل کرلے گا۔ افریقہ یہ ثابت کرنے کیلئے زندہ رہے گا کہ ''سیاہ رنگ بھی خوبصورت ہوتا ہے۔'' افریقہ قدیم ہے لیکن ایشیا سدا بہار ہے۔ اس کی لچک دار اور دیدہ زیب خوبصورتی نے بنی نوع انسان کی تخلیق سے ہی تہذیب کو زینت بخشی ہے۔ لاطینی امریکہ ایک بین الاقوامی کلچر کا مرکزی مقام بن گیا ہے جو اندالوسیا کو عرب اور کیریبین سے منسلک کرتا ہے۔ اس کے شعلہ کی لَو میں کیا حسن ہے۔ یورپ چمک دمک والا اور پسند کئے جانے کے قابل ہے۔ وہ اپنی جانب اس قدر مائل اور راغب کرنے والا ہے کہ وہ اپنے چہرہ کو کئی بار خوبصورت اور دیدہ زیب بنانے کے بعد بھی خوبصورت نظر آتا ہے۔''

ان کی تحریر پراعتماد اور فصاحت و بلاغت سے مرصع ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی ایک مسئلہ یا مسائل کے تجزیہ میں ان کی رائے غلط ہو لیکن وہ کبھی بھی شکوک و شبہات میں مبتلا نہیں ہوئے۔ بے نظیر کیلئے ان کی محبت بے پایاں ہے۔ انہیں اعتماد ہے کہ بے نظیر میں ایسی صلاحیت، جرأت اور سیاسی بصیرت موجود ہے کہ وہ اس مشن کو جاری رکھ سکتی

Copyright © www.bhutto.org

ہیں جوانہیں مکمل کرنے سے روک دیا گیا ہے۔نہرو نے جیل سے اپنی بیٹی ''اندو'' کے نام خطوں میں اُسے اس مشکل کام سے زیر بار نہیں کیا تھا جس سے مسٹر بھٹو نے اپنی موت کی کوٹھری سے اپنی سب سے پیاری بیٹی کو زیر بار کیا ہے بلاشبہ بے نظیر ان کی توقعات پر پوری اتریں گی لیکن یہ دشوار کام قابلِ رشک نہیں ہے۔ہم تو ان کی کامیابی ہی کی دعا کر سکتے ہیں۔

یحییٰ بختیار

کوئٹہ: ۱۰ جنوری ۱۹۸۸ء

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

شہید بھٹو کا بے نظیر کے نام آخری خط

میری سب سے پیاری بیٹی

ایک سزا یافتہ قیدی کس طرح اپنی خوبصورت اور ذہین بیٹی کو اس کے یومِ پیدائش پر تہنیت کا خط لکھ سکتا ہے جبکہ اس کی بیٹی (جو خود بھی مقید ہے اور جانتی ہے کہ اس کی والدہ بھی اسی کی طرح تکلیف میں مبتلا ہے) اس کی جان بچانے کیلئے جدوجہد میں مصروف ہے؟ یہ رابطہ سے زیادہ بڑا معاملہ ہے۔ محبت و ہمدردی کا پیغام کس طرح ایک جیل سے دوسری جیل اور ایک زنجیر سے دوسری زنجیر تک پہنچ سکتا ہے؟

نہرو بھی اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتے تھے۔ نہرو نے بھی جیل سے اسے اس کے یومِ پیدائش پر تہنیت کا پیغام بھیجا تھا۔ میں نے اس امر کا تذکرہ تم سے پہلے بھی کیا ہے اور ایسا یا تو پہلے یا دوسرے خط میں کیا ہے جو میں نے تمہیں لکھا تھا اور دوسرے تین خطوط ۱۹۶۴ء میں جکارتا سے لکھے تھے جب تم چھوٹی بچی تھیں اور مری میں کنوینٹ میں زیرِ تعلیم تھیں۔ صنم، سیما تو اور بھی چھوٹی تھیں۔ اس طویل خط میں، میں نے ذکر کیا تھا کہ نہرو نے کس طرح تاریخ عالم کے بارے میں اپنی بیٹی اندرا کو خطوط لکھے تھے۔ بعد میں یہ خطوط ایک کتاب کی شکل میں جمع کر دیئے گئے تھے اور کتاب کا نام ''گلمپسیز آف ورلڈ ہسٹری'' (عالمی تاریخ کے مناظر) رکھا گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ پہلا خط اندو (اندرا) کے یوم پیدائش پر ایک تہنیتی خط تھا۔ وہ اندرا کو پیار سے ''اندو'' کہتے تھے، جب وہ تیرہ سال کی تھی۔ جس وقت تک میں ۲۳ سال

کا ہوا تھا میں نے ''گلمپسیز آف ورلڈ ہسٹری'' کو چار بار پڑھا تھا۔ نہرو ہمارے زمانہ کے انتہائی صاف ستھری انگریزی لکھنے والوں میں سے تھے۔ ان کے الفاظ میں ایک قسم کا فیضان اور ترنم ہوتا تھا۔

جکارتہ سے ۱۴ سال پہلے میں نے جو خط لکھا تھا اس میں مَیں نے تمہیں متنبہ کر دیا تھا کہ میں نہرو کی نقالی نہیں کر رہا ہوں۔ میں نے ان کی نقالی اس وقت بھی نہیں کی تھی اور نہ ہی اب میں ان کی پیروی کر رہا ہوں۔ بیشک اس وقت میں بھی جیل میں ہوں اور وہ بھی اس وقت جیل ہی میں تھے جب انہوں نے اپنی بیٹی کو خطوط لکھے تھے۔ یہ عنصر میرے اور نہرو کے درمیان قدر مشترک ہے۔ دوسرا عنصر جو میرے اور نہرو کے درمیان قدر مشترک ہے وہ یہ ہے کہ میں نے یہ خط اپنی بیٹی کو اس کی پیدائش کی سالگرہ پر لکھ رہا ہوں۔ لیکن میرے اور نہرو کے درمیان مماثلت بہت زیادہ نہیں ہے۔ نہرو کو جیل میں غیر ملکی حکمرانوں نے ایک جگہ عزت و وقار کے ساتھ رکھا تھا۔ انہوں نے آزادی کے حصول کیلئے جنگ کی تھی۔ وہ بھارتی عوام کے ایک عظیم لیڈر تھے۔ انہوں نے کیمبرج میں تعلیم پائی تھی اور بڑے عز و وقار کے مالک تھے۔ وہ کوئی گھٹیا قسم کے قاتل نہیں تھے اور نہ ہی سرکاری رقوم کے غبن کرنے والے تھے۔ وہ لاڑکانہ کے گاؤں کی کوئی غیر اہم شخصیت نہیں تھے جو حکمران ٹولہ کے ہاتھوں موت کی کوٹھری میں گھل رہے تھے۔ میرے اور نہرو کے درمیان بہت زیادہ فرق ہے۔ ان کی بیٹی ایک تیرہ سالہ چھوٹی سی لڑکی تھی جس نے اس زمانہ کی سیاست میں اپنا کردار ادا کیا تھا اور اس ادارہ کو منظّم کیا تھا جس کو اس نے ''منکی بریگیڈز'' (بندروں کا بریگیڈ) کا نام دیا تھا۔ اس وقت تک ان کی بیٹی سیاست کی آگ میں سے ہو کر نہیں گزری تھی۔ تمہارے گرد آگ جلادی گئی ہے۔

Copyright © www.bhutto.org

اور یہ آگ ایک بے رحم جنتا نے جلائی ہے۔ یہ آگ تباہ کن اور ہولناک ہے۔ اس لئے بہت زیادہ فرق ہے۔ دونوں نا قابلِ موازنہ ہیں۔ اگر کوئی مماثلت ہے تو وہ اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ اندرا گاندھی کی طرح تم بھی تاریخ سازی کر رہی ہو۔ میں اندرا گاندھی سے اچھی طرح واقف ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہوں حالانکہ میں ان کے والد کو زیادہ بہتر طور پر جانتا تھا جیسا کہ تمہارے دادا اس کے دادا کو اس سے بہتر طور پر جانتے تھے جس قدر کہ میں اس کے والد کو جانتا تھا۔ میں ان کی خوبیوں اور اوصاف کا بہت احترام کرتا ہوں اور میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ میں ان کے سب سے بڑے مداحوں میں سے نہیں ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ بھارت کی وزیرِاعظم ہوئیں اور گیارہ سال تک اس اعلیٰ عہدہ پر فائز رہیں۔ وہ بھارت کی دوبارہ بھی وزیرِاعظم ہو سکتی ہیں۔ انہیں ''دیوی'' کا خطاب دیا گیا جب انہوں نے مشرقی پاکستان پر قبضہ جمایا۔ ان تمام باتوں کا علم رکھتے ہوئے مجھے یہ کہنے میں کوئی تذبذب نہیں ہے کہ میری بیٹی جواہر لال نہرو کی بیٹی کے مقابلہ میں جن کو بھارت کی دیوی کہا جاتا ہے کہیں بہتر ہے۔ میں کوئی جذباتی یا ذاتی قسم کا اندازہ نہیں لگا رہا ہوں۔ یہ میری دیانتدارانہ رائے ہے۔

تم میں اور اندرا گاندھی میں ایک شے قدر مشترک ہے کہ تم دونوں یکساں طور پر بہادر ہو۔ تم دونوں پختہ فولاد کی بنی ہوئی ہو، یعنی تم دونوں کی قوت ارادی فولادی نوعیت کی ہے۔ لیکن تمہاری صلاحیت و ذہانت تمہیں کہاں لے جائے گی؟ عام طور پر تو یہ صلاحیت و ذہانت تمہیں اعلیٰ ترین مقام تک پہنچائے گی۔ لیکن ہم ایک ایسے معاشرہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں ذہانت وصلاحیت ایک نقص شمار ہوتی ہے اور دم گھوٹنے والی معمولی قسم کی ذہانت ایک اثاثہ شمار کی جاتی ہے۔ سوائے تمہارے

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

والد کے قائد اعظم اور شاید سہروردی، کے اس ملک پر حکومت شعبدہ بازوں اور کپتانوں نے کی ہے۔ شاید اس صورتحال میں تبدیلی پیدا ہو جائے، اگر کوئی جنگجو قسم کا نوجوان جدوجہد کا آغاز کرے۔ اگر حالات تبدیل نہیں ہوتے ہیں تو پھر تبدیل کرنے کیلئے کچھ نہیں بچے گا۔ یا تو اقتدار عوام کو حاصل ہوگا یا پھر ہر شے تباہ و برباد ہو جائے گی۔

تمہارے دادا نے مجھے فخر کی سیاست سکھائی۔ تمہاری دادی نے مجھے غربت کی سیاست کا سبق دیا۔ میں ان دونوں باتوں کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہوں تاکہ ان دونوں کا انضمام ہو سکے۔ پیاری بیٹی میں تمہیں صرف ایک پیغام دیتا ہوں۔ یہ پیغام آنے والے دن کا پیغام ہے اور تاریخ کا پیغام ہے۔ صرف عوام پر یقین کرو۔ ان کی نجات و مساوات کیلئے کام کرو۔ اللہ تعالیٰ کی جنت تمہاری والدہ کے قدموں تلے ہے۔ سیاست کی جنت عوام کے قدموں تلے ہے۔ برصغیر کی پبلک زندگی میں کچھ کامیابیاں میرے کریڈٹ پر ہیں لیکن میری یادداشت میں صرف وہ کامیابیاں انعام و کرام کی مستحق ہیں جن کے ذریعہ مصیبت زدہ عوام کے تھکے ہوئے چہروں پر مسکراہٹیں بکھر گئی ہیں اور جن کے باعث کسی دیہاتی کی غمناک آنکھ میں خوشی کی چمک پیدا ہو گئی ہے۔ دنیا کے عظیم لیڈروں نے جو خراجِ تحسین مجھے پیش کیا ہے ان کے مقابلہ میں اس موت کی کال کوٹھری میں، مَیں زیادہ فخر و اطمینان کے ساتھ ایک چھوٹے سے گاؤں کی ایک بیوہ کے الفاظ یاد کرتا ہوں جس نے مجھ سے کہا تھا کہ ''صدکوواریاں سولر سائیں'' اس نے یہ الفاظ اس وقت کہے تھے جب میں نے اس کے کسان بیٹے کو ایک غیر ملکی وظیفہ پر باہر بھیج دیا تھا۔

بڑے آدمیوں کے نزدیک تو یہ چھوٹی باتیں ہیں لیکن میرے جیسے چھوٹے آدمی

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

کیلئے یہ حقیقتاً بڑی باتیں ہیں۔تم بڑی نہیں ہوسکتی ہو؟ جب تک کہ تم زمین کو چومنے کیلئے تیار نہ ہو یعنی عاجزی کا رویہ اختیار نہ کرو۔تم زمین کا دفاع نہیں کرسکتیں جب تک کہ تم زمین کی خوشبو سے واقف نہ ہو۔میں اپنی زمین کی خوشبو سے واقف ہوں۔ نظریات۔ اصول۔تحریریں تاریخ کے دروازہ سے باہر ہی رہتی ہیں۔ غالب عنصر عوام کی تمنائیں ہیں اور انکے ساتھ مکمل ہم آہنگی ہے۔ جب اس راگ یا موسیقی کے معنیٰ سمجھ لئے جاتے ہیں تو منزل کے نشان واضح ہو جاتے ہیں۔اور اصول ونظریات کو پیر لگ جاتے ہیں کہ وہ وقت پر اس راگ کی شان کو بڑھانے کیلئے آموجود ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں عملیت کے نظریہ کا پرچار کر رہا ہوں۔عملیت کے نظریہ میں تو بہت کچھ موقع ومحل کے لحاظ سے آسانی ہوتی ہے۔ میں مسئلے کے اصل سبب کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔چیلنج کی اصل وجہ اور جدوجہد کے اصل سبب کو معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

میں اس جیل کی کوٹھری سے تمہیں کیا تحفہ دے سکتا ہوں جس میں سے میں اپنا ہاتھ بھی نہیں نکال سکتا؟ میں تمہیں عوام کا ہاتھ تحفہ میں دیتا ہوں۔ میں تمہارے لئے کیا تقریب منعقد کرسکتا ہوں؟ میں تمہیں ایک مشہور نام اور ایک مشہور یادداشت کی تقریب کا تحفہ دیتا ہوں۔تم سب سے قدیم تہذیب کی وارث ہو۔ اس قدیم تہذیب کو انتہائی ترقی یافتہ اور انتہائی طاقتور بنانے کیلئے اپنا بھرپور کردار ادا کرو۔ ترقی یافتہ اور طاقتور سے میری مراد یہ نہیں کہ معاشرہ انتہائی ڈراؤنا ہو جائے۔ایک خوفزدہ کرنے والا معاشرہ ایک مہذب معاشرہ نہیں ہوتا۔مہذب کے معنیٰ میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور طاقتور معاشرہ وہ ہوتا ہے جس نے قوم کے خصوصی جذبہ کی شناخت کرلی ہو۔جس نے ماضی وحال سے، مذہب اور سائنس سے، جدیدیت اور

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

تصوف سے، مادیت اور روحانیت سے سمجھوتہ کرلیا ہو۔ ایسا معاشرہ ہیجان و خلفشار سے پاک ہوتا ہے اور کلچر سے مالا مال ہوتا ہے۔ اس قسم کا معاشرہ شعبدہ بازی کے فارمولوں اور دھوکہ بازی کے ذریعہ معرض وجود میں نہیں لایا جا سکتا۔ وہ روحانی یا آفاقی اقدار تلاش کی گہرائی سے پیدا ہوسکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک غیر طبقاتی معاشرہ کی تخلیق ہوتی ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ مارکسٹ معاشرہ ہو۔ مارکسٹ معاشرہ نے خود اپنا طبقاتی ڈھانچہ تخلیق کرلیا ہے، یورپ کے مارکسٹوں نے کمیونزم سے انحراف کیا ہے اور انہوں نے ایسا موجودہ طبقاتی ڈھانچہ سے سمجھوتہ کر کے کیا ہے۔ ورنہ ایز یکو برلنگر ''تاریخی سمجھوتہ'' کی کوشش نہ کرتا جو دراصل بالآخر ایلڈ ومورو کے قتل کا باعث ہوا۔

جب میں وزیر خارجہ تھا تو ایک جرمن سفارتکار نے مجھ سے اسلام آباد میں ۱۹۶۵ء میں کہا تھا کہ افریقہ ایک برف کی چادر کے مانند ہے جس پر تیل کی ایک موٹی تہہ جمی ہوئی ہے اور یہ کہ وہ اس حالت میں طویل عرصہ تک رہے گا۔ اس کے ایسا کہنے سے میں متاثر ہوا تھا۔ میرے جیسا دیسی آدمی ایک ایسے سفارتکار کے تجزیہ پر اعتراض یا تنقید نہیں کرسکتا تھا جس کا تعلق آقاؤں کی نسل سے تھا اور پھر وہ تو ایسے مشہور سائنسدان کا بھائی تھا جو میزائلز بنانے کیلئے امریکہ منتقل ہوگیا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس کے تجزیہ کا احترام کرتا ہوں لیکن میری منکسرانہ رائے میں افریقہ گو کہ تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔ اسے نظر انداز کیا گیا ہے اور اس کا تمسخر اڑایا گیا ہے لیکن وہ دو عشروں سے کم عرصہ میں دنیا کے اسٹیج کے مرکز پر نمودار ہوگا یعنی مرکزی حیثیت اختیار کر جائے گا۔ ایسا ہی ہوا ہے۔ لیکن جو جدوجہد افریقہ میں جاری ہے وہ بنیادی طور پر کمیونزم اور آزادی کے درمیان جدوجہد نہیں ہے۔ یہ جدوجہد اس وسیع و

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

عریض اور مشہور و معروف براعظم کے وسائل اور خام مال کیلئے ہے۔فرق یہ ہے کہ جدوجہد کرنے والی ایک پارٹی نے افریقہ کے عوام کی تمناؤں کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرلیا ہے۔ دوسری پارٹی ایسا کرنے میں ناکام رہی ہے باوجود اس کے کہ اینڈ ریو ینگ نے جرأت مندانہ لیکن ناکام کوششیں کی ہیں۔ ابتداء میں تو میں اینڈ ریو ینگ کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اب میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس نے افریقہ کے مسئلے کی جزئیات کو سمجھ لیا ہے اور ایسا دوسری پارٹی کے نقطۂ نظر سے کیا ہے لیکن اینڈ ریو ینگ تنہا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ یا تو بالکل نکال باہر کیا جائے گا یا پھر غیر مؤثر کر دیا جائے گا اور ایسا اس حکومت کی طرف سے ہوگا جو فرانس کے بوربنوں کی طرح کچھ بھی سیکھنے سے انکاری ہے۔

اس سلسلہ میں لیکن ایشیا کے حوالہ سے سیلگ ہیریسن نے حال ہی میں ایک اور محققانہ کتاب لکھی ہے جس کا نام ''دی وائڈ ینگ گلف'' (بڑھتی ہوئی خلیج) ہے۔ یہ کتاب ایشیائی قوم پرستی کے موضوع پر ہے اور اس میں اس ضرورت کا احساس دلایا گیا ہے کہ امریکہ وسیع تر تناظر میں اس صورت حال کو سمجھے۔ پاکستان سے متعلق باب میں کتاب کے صفحہ ۲۷۳ پر اس نے کہا ہے کہ ''ذوالفقار علی بھٹو نے (جنہوں نے بعد میں وزیر خارجہ کی حیثیت سے پیکنگ کے ساتھ قریبی روابط کا آغاز کیا) نومبر ۱۹۶۲ء سے ہی پاکستان کو چین کے خلاف تصورات سے الگ کرنا شروع کر دیا تھا جب انہوں نے قومی اسمبلی سے کہا تھا کہ 'پیکنگ کے ساتھ پاکستان کی دوستی ایک آزاد عنصر ہے اور یہ کہ اگر کشمیر کا تنازعہ صلح صفائی کے ساتھ طے بھی ہو جاتا ہے تب بھی ہم چین کے خلاف بھارت کا ساتھ نہیں دیں گے۔ برصغیر ہند کے واسطے مشترکہ دفاع کا مغربی مقصد ایک مخالف چین کے تصور پر مبنی تھا لیکن ہوسکتا ہے کہ

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

پاکستان اور بھارت دونوں کیلئے اس مسئلے کا حل چین کے ساتھ ہماری دوستی کو خطرہ میں ڈالے بغیر ہمارے درمیان ایک قسم کی مساوات کو دریافت کرنا ہے۔ اگر ہم دونوں صحیح پالیسی پر عمل کریں تو مشترکہ دفاع کا سوال غیر متعلق ہو جائے گا'۔اس کے فوراً بعد ایک انٹرویو میں (راولپنڈی ۱۰دسمبر ۱۹۶۲ء) بھٹو نے پہلے پاکستان کا تصور پیش کیا۔ چین کے بارے میں امریکی مفاد کی شناخت کی جو ان کی پالیسیوں میں نمایاں رہی اور جس کی توضیح بعد کے برسوں میں وہ مجھ سے اکثر اوقات کرتے تھے۔ (بھٹو نے ۲۰دسمبر ۱۹۶۷ء کو لاڑکانہ میں ایک انٹرویو کے دوران چین اور امریکہ کے درمیان دیتانت کی توقع کی از سرنو تصدیق کی اور بعد میں ''متھ آف انڈی پینڈ ینس'' میں (آزادی موہوم) صفحہ ۲۱ پر ایسا کیا) انہوں نے یہ تسلیم کیا کہ قلیل المیعاد لحاظ سے تو چین اور پاکستان کے تعلقات پاک امریکہ تعلقات کیلئے نقصان دہ ہوں گے لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا کہ چین اور امریکہ اپنے اختلافات کو ختم کر دیں گے اور غالباً ایسا ۱۹۷۰ء کے عشرہ کے شروع میں ہوگا۔ بہرحال چین، پاکستان کی دوستی کا اس لئے حق دار ہے کہ وہ ایشیائی خودداری اور خوداعتمادی کا چیمپئن ہے جس کو پاکستان میں وسیع پیمانہ پر سراہا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا یہ منطق نہ صرف بذاتِ خود توجہ کی مستحق ہے بلکہ اس میں مزید کشش وجاذبیت پیدا ہو جائے گی۔ اگر بھارت اور چین کی رقابت میں اضافہ ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ میں لازمی طور پر پاکستان اور چین کے درمیان سلامتی کے مشترکہ مفادات پیدا ہو جائیں گے۔ بھٹو نے صحیح اندازہ لگایا تھا کہ بھارت اور چین کے تنازعہ میں شدت پیدا ہوگی اور چین اور پاکستان کا تعلق جلد ہی لازمی طور پر بھارتی تعلق کے اثر سے مستحکم ہوا جس کا بالآخر نتیجہ یہ ہوا کہ پیکنگ نے نئی دہلی کو ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران الٹی میٹم دیا اور

Copyright © www.bhutto.org

پاکستان کو کافی فوجی امداد دی۔''

اس سے پہلے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۷ پر سیلگ ہیریسن نے لکھا ہے کہ ''مسلم لیگ کے لیڈروں نے جو ابتدا میں پاکستان کی تخلیق کے ذمہ دار تھے اپنی اپیل کی بنیاد صرف مذہب پر رکھی تھی اس لئے کہ وہ تنگ نظر جاگیرداروں کے اقتصادی مفادات کی نمائندگی کرتے تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر ایسا ہوا کہ بعد کی حکومتوں نے زیادہ تر سماجی انصاف کو نظرانداز کیا، یہاں تک کہ ذوالفقار علی بھٹو نے بنگلہ دیش جنگ کے بعد جو کچھ بچا تھا اس کو بچانے کی کوشش کی۔''

سیلگ ہیریسن کی کتاب ''دی وائیڈ ینگ گلف'' سے حوالہ دینے کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ اگر ۱۹۶۲ء میں مَیں صحیح طور پر امریکہ اور چین کے تعلقات کے بارے میں اندازہ لگا سکتا تھا پھر میں اپنے ملک کے بارے میں تو اور زیادہ جانتا تھا کہ اسے برصغیر اور خطہ میں کیا رول ادا کرنا ہوگا۔ اسی مقصد سے میں نے جرمن سفارتکار کے ساتھ اپنی گفتگو کا حوالہ دیا ہے جو راولپنڈی میں ۱۹۶۵ء میں ہوئی تھی اور افریقہ کے مستقبل کے بارے میں تھی۔

ایشیائی قوم پرستی میں مختلف عناصر شامل ہیں۔ یہ تصور متحرک بھی ہے اور ارتقائی بھی ہے۔ یہ تصور یقینی طور پر جمود والا نہیں ہے۔ اس کا مطلب اب ''ہندوستان چھوڑ دو'' نہیں ہے۔ ایشیائی قوم پرستی کے درخت کی بہت سی شاخیں ہیں۔ وہ اپنا سایہ ایک وسیع وعریض زمین پر ڈالتا ہے۔ وہ کسی قدیم یا جامد نوعیت کی تعریف کو چیلنج کرتا ہے۔ سب سے تباہ کن غلطی جو امریکہ نے ویتنام میں کی تھی وہ یہی تھی کہ اس نے ایشیائی قومیت کے تصور کو بہت زیادہ آسان کیا تھا، ایشیائی قومیت کے موزیک میں جو قدیم

ثقافتوں اور قدیم مذاہب سے ملک بنا ہے کیا کمیونزم ایشیائی قومیت کا ایک حصہ ہے یا ایشیائی قومیت کمیونزم کی تابع ہے۔؟ اس سوال کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ اس کا انحصار ہر ملک کی تاریخی حیثیت پر ہے۔ کچھ ممالک میں تو ایشیائی قومیت کمیونزم کی تابع ہے اور کچھ ملکوں میں تابع نہیں ہے ۔ ایشیا میں کچھ ممالک ایسے ہیں جہاں یہ سوال عملی شکل میں پیدا نہیں ہوا ہے۔

جدید کمیونزم کیا ہے؟ کیا وہ روس کا کمیونزم ہے یا چین کا کمیونزم ہے۔ یا ٹیٹو اور کاسٹرو کا کمیونزم ہے؟ کیا وہ ویتنام اور کمبوڈیا کا کمیونزم ہے یا انگولا کا قومی کمیونزم ہے؟ کیا یہ یورپی کمیونزم ہے؟ اگر یہ یورپی کمیونزم ہے تو کیا وہ اٹلی کا '' تاریخی سمجھوتہ یا مفاہمت'' یا پھر اسپین کا کمیونزم ہے جس نے لینن کے اصولوں سے لاتعلقی اختیار کر لی ہے۔ اگر ایشیاء کا کمیونزم تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہے تو پھر افریقہ کا کمیونزم تو اور بھی زیادہ تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہے۔ اس امر پر تشویش کا اظہار کیا گیا ہے کہ کیوبا والے افریقہ کی گڑبڑ والی سرزمین میں موجود ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ تشویش بغیر کسی سبب کے ہے۔ میں اس قسم کا انتہا پسند فیصلہ نہیں کروں گا۔

صورتیں کبھی بھی ایک جیسی نہیں ہوتی ہیں۔ اس محدود صورتحال کو تسلیم کرتے ہوئے میں ویتنام کو دی جانے والی زبردست اور انمول حمایت کا حوالہ دوں گا جو چین نے ویتنام کو دی تھی جس نے مغربی فوجی مداخلت کے خلاف طویل جدوجہد کی تھی۔ جنگ کے خاتمہ کے تین سال کے اندر ہی ویتنام اور چین کے درمیان تعلقات کشیدہ نظر آتے ہیں۔

اگر جنوب مشرقی ایشیا میں ایسی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے تو افریقہ کے کچھ

حصوں میں کیوباوالوں کی موجودگی کالازمی طور پر مطلب مستقل تباہی نہیں ہے۔خواہ سچ ہو یا غلط ہو، ادیس ابابا میں کیوباوالوں اور ایتھوپیا کی جنتا کے درمیان اختلافات کی افواہیں گردش کر رہی ہیں۔ بنیادی طور پر افریقہ میں کمیونزم جو اپنا مقصد حاصل کر رہا ہے وہ انگولا یا ایتھوپیا میں کیوباوالوں کی موجودگی کے باعث نہیں ہے بلکہ اس سبب سے ہے کہ مغربی طاقتوں نے افریقی عوام کی جائز تمناؤں اور حقیقی شرائط کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر زائرے میں فوجی مداخلت اس نسل کے کپلنگ کے ہم خیال لوگوں کے دلوں کو خوش کر سکتی ہے لیکن بالآخر اس کے باعث افریقہ میں کمیونزم کا اثر ورسوخ اس سے زیادہ قائم ہو گیا ہے جس قدر کہ کاسٹرو کی کوششوں سے براعظم افریقہ میں قائم ہو سکا ہے۔

میں افریقہ میں روس یا کیوبا کی پالیسیوں کی حمایت نہیں کر رہا ہوں۔ میں اصولوں کی وضاحت کر رہا ہوں۔ اصول یہ ہے کہ کوئی بھی طاقت جو افریقی عوام کی جائز تمناؤں سے وابستگی اختیار کرتی ہے اور ان کے صحیح تشخص کے تعین میں مدد دیتی ہے اس کو محض عالمی وابستگیوں اور مطلب پرستانہ مفادات کی بنیاد پر تنقید کا نشانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی کیوباوالا یا روسی شہری خواہ وہ دانشور ہو یا فنی ماہر ہو، اریٹیریا کی سرزمین پر قدم رکھتا ہے تو میں ایسے اقدام کو شدید مذمت کا مستحق سمجھوں گا اور اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کی مذمت کروں گا۔ اریٹیریا اپنی آزادی کے واسطے حقیقی جدوجہد کر رہا ہے۔ نہ تو مشرق اور نہ ہی مغرب اس امر سے انکار کر سکتا ہے کہ ایتھوپیا کا اریٹیریا پر قبضہ جارحیت کے نتیجہ میں محض فتح کے سبب تھا۔ ہمیں اس کی طرف داری کرنی چاہیئے جو حق پر ہو۔ ہمیں محض مفادات کی خاطر تعلق کی بنیاد پر پہلے سے متعین کردہ پوزیشن اختیار نہیں کرنی چاہیئے۔

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

نظریاتی معنیٰ میں ایشیا کے مقابلہ میں افریقہ کا ذہن کم پختہ ہے لیکن ایشیا کی طرح افریقہ کی غالب قوت اس کا قومیت اور مساوات کا جذبہ ہے۔قومی جذبہ کے اس قبائلی اور مختلف النوع تصور میں کمیونزم کے رنگ کی حد کا انحصار روس یا کیوبا یا مشرقی جرمنی کی افریقی براعظم میں موجودگی کے مقابلہ میں مغرب کے ردِعمل کے طریقۂ کار پر زیادہ ہے۔ افریقہ کے بارے میں مغرب کے رویہ میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔''بدشکل کالے آدمی'' کے فخر اور احساس کے جذبہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔صرف زبانی خدمت کی ڈپلومیسی کافی نہیں ہوگی۔افریقہ کی دونوں ہاتھوں سے لوٹ بند ہو جانی چاہئے۔ یہ کافی رعایت نہیں ہے کہ کسی منی بس میں کسی افریقی کے برابر بیٹھ جایا جائے۔افریقہ تبدیل ہو چکا ہے اور وہ تبدیل ہوتا رہے گا۔افریقہ کے عوام گو کہ قبائلی اور پسماندہ ہیں لیکن وہ بے عزتی کو برداشت نہیں کریں گے۔ایشیا کی صورتحال اسی طرح پیدا ہوئی۔افریقہ کی صورتحال اسی طرح وقوع پذیر ہوگی اور زیادہ تیزی اور شدت کے ساتھ پیدا ہوگی۔

نوازشِ خسروانہ جتانے اور مربی ہونے کے لمبے چوڑے دعوے کرنے کا وقت گزر چکا ہے۔جنگجو افریقہ کا عام آدمی اب غیر ملکی استحصال کرنے والے کے سامنے زمین پر نہ تو رینگے گا اور نہ ہی سجدہ ریز ہوگا جیسا کہ ۱۸۹۶ء میں اشنتی شاہی خاندان والوں نے کیا تھا۔ اب جو صبح نمودار ہونے والی ہے اس میں افریقہ قبائلی اور نو آبادیاتی نظام کے ورثہ پر قابو پالے گا اور وہ ایک باعزت و باوقار مستقبل کی اپنے بچوں کیلئے تعمیر کرے گا جو اس وقت ظلم وتشدد کا شکار ہے۔

مغربی یورپ میں کیا صورتحال ہے؟ مغربی یورپ کے نوجوان جو ایک عظیم تہذیب کے سرگرم کارکن ہیں کمیونزم سے کہیں آگے چلے گئے ہیں۔ دوسرے الفاظ

میں کمیونزم پیچھے رہ گیا ہے۔ اس سبب سے دوسری باتوں کے علاوہ اور شاید کچھ بنیادی لحاظ سے مغربی یورپ کی صورت حال افریقہ یا ایشیا یا لاطینی امریکہ کے مقابلے میں زیادہ سنگین نوعیت کی ہے۔ مغربی یورپ کو پہلے کٹر مذہبی معنیٰ میں اپنے آپ کو بچانا ہے قبل اس کے کہ وہ چھاتہ بردار فوج کی ڈپلومیسی کے ذریعہ افریقہ کو بچانے کی کوشش کرے۔ سرمایہ دارانہ نظام مغربی یورپ میں شدید قسم کے عوارض میں مبتلا ہے۔ وہ ترقی کی حدود سے تجاوز کر چکا ہے۔ مغربی اقوام کیلئے کینیز اور ہتک فرسودہ ہو چکے ہیں۔ اندرونی تضادات اب پھٹ پڑنے کے قریب آ لگے ہیں۔ جدید نسل موجودہ صورتحال سے بیزار ہو چکی ہے۔ ایک وقت تھا کہ نوجوانوں نے مغربی یورپ کی کمیونسٹ پارٹیوں سے امیدیں وابستہ کر لی تھیں لیکن مغربی یورپ کی کمیونسٹ پارٹیوں نے نوجوانوں اور محنت کش طبقات کو قطعی طور پر ناامید اور مایوس کیا ہے اس لئے کہ وہ طویل عرصہ تک ''ہونے یا نہ ہونے'' کے درمیان تذبذب کا شکار رہیں۔ یورپی کمیونزم کے رول کے بارے میں شک وشبہ میں اضافہ ہو رہا ہے کہ آیا وہ زوال پذیر سرمایہ دارنہ نظام کا قابل عمل اور فعال متبادل ہے یا نہیں۔ یورپی کمیونزم کو برقی عمل کے ذریعہ ناکارہ بنا دیا گیا ہے۔ اور اس طرح ایک انقلابی قوت کی حیثیت سے اسے غیر مؤثر کر دیا گیا ہے۔ اس کے زوال نے مغربی یورپ میں روس کے سیاسی اثر ورسوخ کو متاثر کیا ہے لیکن انقلابی نظریہ کی حیثیت کو متاثر نہیں کیا ہے۔ اب یہ نظریہ زیادہ جارحانہ شکل اختیار کر رہا ہے۔ نوجوان اور رومانوی تصورات کے قائل افراد زیادہ شدت کے ساتھ تشدد اور گھٹن کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ ایک نئے متبادل کی تلاش میں ہیں جو ایک بے صبر اور تخیلاتی نسل کی انقلابی اور رومانوی امنگوں کی تکمیل کر سکے۔ وہ پلاسٹک کے دور سے عاجز آ گئے ہیں۔ وہ یورپی کمیونزم

Copyright © www.bhutto.org

کے وعدوں سے بالکل مایوس اور ناامید ہو گئے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ یورپی کمیونزم کا سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ نام نہاد سمجھوتہ رجعت قہقری کا باعث ہوا ہے۔ وہ اس رجعت قہقری کیلئے بالکل تیار نہیں ہیں۔ وہ آگے بڑھ کر اندھیرے میں کود جانے کو ترجیح دیں گے۔

وہ پسندیدہ نعرہ جس نے مئی ۱۹۶۸ء میں فرانس میں مقبولیت حاصل کی تھی یہ تھا کہ ''ممانعت کرنا منع ہے'' کوئی شے بھی یورپ کے نوجوانوں کے لئے مانع نہیں ہو سکتی کہ وہ کمیونزم اور سرمایہ دارانہ نظام دونوں ہی کو مسترد کر دیں۔ ان دونوں نظاموں کی غیر موجودگی میں وہ کون سے نظام کی تعمیر کریں گے؟ کیا ایک نئے فلسفہ کے ساتھ نظام یا ڈھانچہ تعمیر کرنے کے ان کے تصور کا مطلب عمداً خود کو تباہ کرنا ہے؟ یہ بات تو پاگل پن معلوم ہوتی ہے لیکن یورپ کے نوجوان پاگل تو نہیں ہیں۔ اگر عالمگیر دھماکہ دوسروں کے حکم و ہدایت پر ہونا ہے تو یہ اقدام زیادہ خودداری پر مبنی ہوگا کہ عالمگیر تباہی کے غیر ملکی احکامات سے پہلے اپنے آپ کو چھوٹے پیمانہ پر اور زیادہ انسانی سطح پر خود ہی تباہ کر لیا جائے۔ دل کہتا ہے کہ سچائی کو دریافت کرنا ہے اور دل فیصلہ کر لیتا ہے۔ جب چنگیز خان منگولیا کے ایک دور دراز گاؤں سے تھوڑے سے سواروں کے ساتھ روانہ ہوا تھا تو کیا اس نے یہ تصور کیا تھا کہ وہ اور اسکی آئندہ نسلیں یورپ، چین اور بھارت میں اندر تک گھس جائیں گی اور ایک ایسا نظام فراہم کریں گی جو آئندہ کئی نسلوں تک قائم رہے گا؟

تاریخ نے انسانوں کی ایسی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں کہ وہ تباہ کرنے کے مصمم ارادہ سے روانہ ہوئے لیکن تباہ کرنے کے بجائے انہوں نے تعمیری کام کیا۔ تاریخ ان لوگوں کی مثالیں بھی پیش کرتی ہے جو تعمیر کرنے کے ارادہ سے روانہ ہوئے

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

تھے لیکن تعمیر کے بجائے انہوں نے تخریب کی۔ سار بونے، ہائیڈ برگ اور ٹرینٹ نوجوان مردوں اور عورتوں کے دلوں میں ایک شعلہ بھڑک رہا ہے لیکن آکسفورڈ اور کیمبرج کے نوجوان مردوں اور عورتوں کے دلوں میں یہ جذبہ موجزن نہیں ہے۔ صرف وقت ہی بتائے گا کہ آیا یہ شعلہ دنیا کو سوز کرے گا اور نئی روشنی عطا کرے گا یا ساری روشنیاں بجھ جائیں گی۔

مغربی یورپ میں صورت حال ایشیا اور افریقہ کے مقابلہ میں اور زیادہ پیچیدہ ہے۔ افریقہ میں اقتدار کا کھیل بالکل ابتدائی مرحلہ میں ہے۔ ایشیا میں اقتدار کا یہ کھیل ایک طے شدہ تبدیلی بن گیا ہے۔ یورپ میں یہ کھیل اپنے عروج کو پہنچ گیا ہے لیکن تعجب یہ ہے کہ یورپ کو افریقہ کے بارے میں زیادہ فکر ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ میں خوفزدہ نہیں ہوں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران صدر روز ولٹ نے کہا تھا کہ ''ہمیں خوف کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن ہم خوف کرتے ہیں۔'' کمیونزم کا خوف کمیونزم کے مقابلہ میں زیادہ مہلک ہے۔ مغربی یورپ میں کٹر قسم کے کمیونزم کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر ایشیا میں سوائے چین کے یہ قومی جذبہ (نیشنلزم) کے وسیع چشموں میں سما گیا ہے۔ افریقہ میں ایک نئی قسم کا جنگجو یا نہ نو آبادیاتی نظام اس کی سرپرستی کر رہا ہے اور ضروری نہیں کہ چھوٹے سے کیوبا کا عظیم کاسٹرو ایسا کر رہا ہو۔ پھر بھی اس نے کوئی حتمی اظہار کی شکل اختیار نہیں کی ہے۔ چند مزید برسوں تک یہ ایک گھومنے والے دروازہ کا کھیل رہے گا اور کرسیوں کی تبدیلی کا کھیل بنا رہے گا۔

مشرق وسطیٰ کے بارے میں جس چیز کی مجھے فکر ہے وہ کمیونزم کا چیلنج نہیں

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

ہے۔کوئی بھی معقول نظام ایسے ممالک میں کامیاب ہوسکتا ہے جہاں غیر محدود قسم کی خوشحالی ہو اور چھوٹی سی آبادی کے تصرف میں ہو۔ جب میں معقول نظام کی بات کرتا ہوں تو اس سے میری مراد روایتی قسم کا نظام ہوتا ہے جس کو ایک روشن خیال اور محبّ وطن قیادت نے اپنایا ہو اور اس پر معقول انداز میں عمل کیا ہو۔ تیل پیدا کرنے والے ممالک کو فوری خطرہ پڑوسی ممالک کے فوجی جنتاؤں کی مہم جوئی سے ہے۔ فوجی جنتاؤں سے میری مراد مطلب پرست جنرلوں کی فوجی حکومت ہے اور ترقی پسند پارٹی ڈکٹیٹر شپ نہیں ہے جس میں فوج انقلاب کی ایک منظّم اور ماتحت تلوار کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ تیل پیدا کرنے والے ممالک کے سیاسی عزائم رکھنے والے جنرل پڑوسی ممالک کے جنرلوں کے نقش قدم پر چل سکتے ہیں اور کھیل تماشے کر سکتے ہیں۔ ایک خطرہ تو یہ ہے۔ دوسرا خطرہ اسرائیل کی جانب سے اچانک فوجی کارروائی ہے تاکہ وہ مشرقِ وسطیٰ کی تیل کی دولت پر قابض ہو سکے۔ اس امکان کو نظر انداز نہ کیجئے۔ جس قدر زیادہ ضدی اور ہٹ دھرم اسرائیلی وزیراعظم ہوتا ہے اسی قدر یہ خطرہ سر پر زیادہ منڈلانے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اسرائیل کے پاس ایٹمی اسلحہ موجود ہے۔ مشرقِ وسطیٰ اور آس پاس کے علاوہ میں فوجی ڈکٹیٹر شپ ذیلی قومیتوں والے ممالک میں قومی، ریاستی نظام کے جلد تر شکست و ریخت کا باعث ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوسکتا ہے کہ کمیونسٹ طاقت کا بالآخر کنٹرول قائم ہوسکتا ہے۔

شہنشاہ ایران نے ایران میں خلفشار کے نتائج کے بارے میں جون ۱۹۷۹ء میں جو تبصرہ کیا تھا وہ بالکل درست تھا۔ انہوں نے کہا کہ ایران کے تخت طاؤس پر یا تو کوئی بادشاہ جلوہ افروز ہوتا ہے جو اگر ضروری ہو تو آئینی اصلاحات کرتا ہے اور یا یہ

تخت طاؤس ایران کے بہت سے عجائب گھروں میں سے کسی عجائب گھر میں رکھ دیا جاتا ہے۔ آخری تجزیہ کے لحاظ سے ایران میں بادشاہت کا متبادل نہ تو مُلاّ کی حکومت ہے اور نہ ہی فوجی جنتا کی حکومت ہے۔ بادشاہت کا متبادل تو وہ پارٹی ہے۔ لبرل جمہوریت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ایران میں لبرل جمہوریت کی روایت نہیں ہے۔ یہ بادشاہت کے تحت کام کرسکتی ہے جس میں پارلیمنٹ کو جمہوری اختیارات حاصل ہوں لیکن وہ نگرانی والے کنٹرول کے بغیر جلد ہی ختم ہو جائے گی۔ اول تو حریص جنرل جمہوریت کی نام نہاد گڑبڑ سے فائدہ اٹھائیں گے، دوسرے اس کے بعد جنرل مال غنیمت کیلئے ایک دوسرے سے جھگڑا کریں گے۔ اس کی وجہ سے ان کے اور عوام کے درمیان تنازعہ پیدا ہوگا۔ تو وہ پارٹی ملبہ کو بچانے کی غرض سے اس خلا میں داخل ہوگی جیسا کہ نپولین فرانس کے ملبہ کو بچانے کیلئے منظر عام پر نمودار ہوا تھا یا زار کے زوال کے بعد لینن روس کے ملبہ کو بچانے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا تھا یا حال ہی میں ماؤزے تنگ وسطی ریاست کے زوال کے بعد (جو چیانگ کائی شیک کو ورثہ میں ملی تھی) چین کے ملبہ کو بچانے کی غرض سے کمر بستہ ہو گیا تھا۔

لاطینی امریکہ عرصہ سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے زیر سرپرستی ہے۔ اس سے قبل اسپین اور پرتگال کا نوآبادیاتی نظام بڑا ظالمانہ تھا۔ لاطینی امریکہ کو اسکی جبلی صلاحیت کے مطابق ترقی کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ جمہوریت کا درخت لاطینی امریکہ کی گرم زمین میں نہیں اگایا گیا۔ میکسیکو میں بادشاہت قائم کرنے کے نپولین سوئم کے مضحکہ خیز تجربہ کے سوائے میکسیکو میں بادشاہت کی روایت موجود نہیں تھی۔ لاطینی امریکہ جذباتی اور پارہ صفت لوگوں کا ایک وسیع وعریض براعظم تھا جہاں نہ تو بادشاہت کی اور نہ ہی جمہوریت کی دیسی روایت قائم تھی۔ لاطینی امریکہ فوجی

ڈکٹیٹروں کا براعظم بن گیا تھا جنہوں نے اسپین اور پرتگال کے غیرملکی نوآبادیاتی نظام کی جگہ لے لی تھی اور اپنا داخلی قسم کا نوآبادیاتی نظام قائم کیا تھا۔ جمہوری روایات کی عدم موجودگی نے ان کے ظلم وتشدد کو آسان بنا دیا تھا۔ وہ زیادہ تر بلکہ سب ہی امریکہ کی خوشامدیں کرنے والے تھے۔ ان میں سے اگر کسی کے خیالات مختلف ہوتے تھے تو وہ یا تو برطرف کر دیا جاتا تھا اور یا قتل کر دیا جاتا تھا۔ ان تذلیل کن حالات نے ۱۹۵۸ء میں کاسٹرو کو پیدا کیا اور اس ورثہ نے لاطینی امریکہ میں کاسٹرو کی پوزیشن کو مستحکم کیا ہے۔ چھوٹا سا کیوبا ایک بڑی طاقت کے گوشت میں ایک کانٹے کی طرح چبھ رہا ہے اور افریقہ میں وہ مغربی یورپ کی طاقتور اقوام کیلئے ایک ڈراؤنے خواب کی طرح ہے۔ لاطینی امریکہ عظیم تبدیلیوں کے دہانہ پر کھڑا ہے۔ یہ تبدیلی خون آشام اور پرتشدد ہوگی۔ یہ عوام اور فوجی جنتا کے درمیان ایک جدوجہد ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس کشمکش میں عوام کی فتح ہوگی۔ مداخلت ہوگی لیکن اس مداخلت کے باعث جنگ اور بھی زیادہ خون آشام اور شدید ہو جائے گی اور عوام کی مکمل فتح یقینی ہو جائے گی۔

افریقہ کیلئے مناسب حل تلاش کرتے ہوئے یہ مشورہ بھی مساوی طور پر درست ہوگا کہ لاطینی امریکہ کے مسئلہ پر بھی روشن خیالی کے طریقہ کار کا اطلاق کیا جائے۔ یہ اس قسم کے معقول اور بے لوث طریقہ کار کا وقت ہے۔ اس کے بعد بہت دیر ہو جائے گی۔ یہ اچھی بات ہے کہ نہر پنامہ کے معاہدات جیسے کچھ بھی ہیں ٹھیک وقت پر ہوئے ہیں ورنہ نتائج طویل المیعاد قسم کے تنازعہ کے حل سے قبل کے سمجھوتہ کیلئے نقصان دہ ہوتے۔ بلاشبہ فیڈرل کاسٹرو لاطینی امریکہ کے حالات کی پیداوار ہے۔ تاہم یہ کہنا بھی بالکل درست ہوگا کہ وہ لاطینی امریکہ کے بارے میں امریکی

Copyright © www.bhutto.org

پالیسیوں کی پیداوار ہے۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ کاسٹرو اپنے سگار کے دھوئیں کے غباروں کو لاطینی امریکہ کے اردگرد اور اب افریقہ کے اردگرد پھینکنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور وہ ایسا اس لئے کر سکا ہے کہ امریکہ نے اپنا بنیادی رویہ لاطینی امریکہ کے بارے میں تبدیل کرنے اور افریقہ کے بارے میں نظریاتی رویہ اپنانے سے انکار کر دیا ہے۔ دونوں ہی براعظموں کیلئے مساوات اور فراخ دلانہ شراکت کا رویہ درکار ہے۔

مشرقی یورپ حالات سے سمجھوتہ کر رہا ہے جو نظر آتا بھی ہے اور نظر نہیں بھی آتا ہے۔ کمیونزم کے بارے میں مایوسی اور تنقید میں اضافہ ہو رہا ہے اور اسٹالن کے معاملہ میں کمیونزم کو ایک واحد نظریہ کے طور پر اپنانے پر تنقید میں اضافہ ہوا ہے۔ البانیہ بھی اب کمیونزم سے اس قدر وابستہ نہیں ہے جس قدر کہ وہ چند سال پہلے تھا۔ ٹیٹو تیس سال پہلے سنگی پن سے مسکرایا تھا۔ سیسکو مشرق اور مغرب کے درمیان اور مشرق اور مشرق کے درمیان پلوں کی تعمیر میں مصروف ہے۔ برانٹ کی سیاست نے نئی راہیں کھول دی ہیں جو دو عشروں قبل نہ تو قابل قبول تھیں اور نہ ہی انہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ نئی صورتحال ابھی تک مستحکم تو نہیں ہو سکی ہے لیکن مجموعی طور پر اس وقت اس کی حمایت ہیلسنکی معاہدہ سے ہوتی ہے۔

بڑی طاقتوں کے تعلقات اور ان کے درمیان تعلقات اثر ورسوخ کے خطوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ وہ فوجی حکمت عملی کے گھیراؤ کے تصور سے متاثر ہوتے ہیں۔ ایٹمی دہشت کے توازن سے متاثر ہوتے ہیں اور ایسے عارضی قسم کے تعلق سے متاثر ہوتے ہیں جس کی نشاندہی وقتاً فوقتاً اشتعال انگیزی اور بیماری کے سے دوروں سے ہوتی ہے۔ یہ تیسری دنیا کے انمول وسائل پر کنٹرول اور غلبہ حاصل کرنے کی تلاش

ہے۔ ہم اس کھیل میں شطرنج کے مہروں اور کھلونوں کی طرح اس وقت تک رہیں گے جب تک ہم شطرنج کے مہرے بنے رہنے پر فخر کرتے رہیں گے اور جب تک ہمیں کھلونے بنے رہنے کا شوق رہے گا۔

ایک وقت تھا جب امریکہ کا ایک وزیر خارجہ ۷۰ کلفٹن میں کھانے کی میز سے غصہ کی حالت میں تقریباً اٹھ کھڑا ہوا تھا جب میں نے اس سے کہا تھا چین کے بارے میں اس کے ملک کی خارجہ پالیسی غیر منطقی ہے اور کوتاہ نظری پر مبنی ہے۔ حال ہی میں زبگینو بریزینسکی جو صدر کارٹر کے قومی سلامتی کے مشیر ہیں چین گئے اور ایسی باتیں کیں کہ گویا امریکہ اور چین کے درمیان دیتانت کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ مسٹر بریزینسکی تو چینی لیڈروں کو خوش کرنے کیلئے اچھی باتیں کرتے ہیں جبکہ امریکی وزیر خارجہ سائرس وانس روسیوں سے اگر ایسی اچھی نہیں تو کم از کم سنجیدہ قسم کی باتیں سالٹ کے معاہدہ کے بارے میں کرتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ افریقہ میں روس کی پالیسی کو سمجھ میں نہ آنے والی پالیسی کا نام دیا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میں ذہین نہیں ہوں لیکن میں ''اسٹیرٹیجک اسلحہ'' کے اخلاقی معنیٰ نہیں سمجھ سکا ہوں۔ امریکہ کے ''مائی نیوٹ مین'' میزائلوں کے بارے میں جو یہ تصور تھا کہ وہ روس کے حملے سے محفوظ ہیں ان کو بھی اب اسلئے خطرہ پیدا ہوگیا ہے کہ روسی میزائلوں کے بالکل صحیح نشانہ پر لگنے کے امکان میں اضافہ ہوگیا ہے اور قبل اس کے کہ ''مائی نیوٹ مین'' انتقامی کارروائی کرے روسی میزائل اسے تباہ کر سکتے ہیں۔ اب امریکی اس تلاش میں مصروف ہیں کہ ''مائی نیوٹ مین'' کا متبادل میزائل بنائیں یا اس کے ساتھ کسی دوسرے میزائل کا اضافہ کریں۔ سالٹ معاہدہ کے ناقدین کا خیال ہے کہ ''مائی نیوٹ مین'' کے متبادل میزائل (مثلاً کروز میزائل، ہاتھ سے پھینکنے والا ایم ایکس میزائل ۔

Copyright © www.bhutto.org

ٹرائیڈینٹII آبدوز میزائل اور بی ۔۵۲ کے پیچھے چلنے والا بمبار طیارہ) سالٹ معاہدہ اور بی ۔ ۱ کینسل کئے جانے کے باعث بنایا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ سالٹ معاہدہ کے پروٹوکول میں تین سالہ توسیع کے امکانات کا انحصار زیادہ تر مزید روسی مراعات پر ہے۔

''اسٹیرٹیجک اسلحہ'' کی خواہ کوئی تعریف ہو یہ ایک مسئلہ ہے کہ آیا روس دوسرے سالٹ معاہدہ پر مزید مراعات دے گا اور افریقہ میں اپنی پالیسیوں کو بڑھانے سے باز آ جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی روس اور چین مذاکرات میں مصروف ہیں جو کبھی تو بڑے گرما گرم ہوتے ہیں اور کبھی اس قدر گرما گرم نہیں ہوتے ہیں۔ جاپان اور وفاقی جمہوریہ جرمنی ایک اُلجھانے والی صورت حال سے بیزار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ دونوں ممالک اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وفاقی جمہوریہ جرمنی تمام ہی حالات میں یورپ کے مسئلہ پر روس کے ساتھ زیادہ مضبوط اور جامع مفاہمت کے امکان کو رد کر دے گا۔ یہی بات جاپان اور چین کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے جہاں تک ایشیا کے متعلقہ تھیٹر کا تعلق ہے، آج کل کی وابستگیوں کے سیاسی جوڑ توڑ میں اس رجحان کو عام بول چال میں ''فنلینڈائزیشن'' کہا جاتا ہے۔

میں مکرر کہتا ہوں کہ صورت حال میں تبدیلی کا عمل جاری ہے۔ ایک طرف دیتانت ہے۔ دوسری جانب بہت سے نئے تنازعات پیدا ہو گئے ہیں۔ جو علاقائی بھی ہیں اور عالمی بھی۔ درمیان میں بھی ہیں اور اندر بھی۔ ان کے گہرے سیاسی، فوجی اور اقتصادی عوامل ہیں۔ کچھ تجزیہ نگار تو کہیں گے کہ ایک نئی سرد جنگ شروع ہوا چاہتی ہے جبکہ کچھ دوسرے تجزیہ نگار اس سے بھی آگے بڑھ کر کہیں گے کہ تیسری

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

عالمی جنگ اس دور کے معنیٰ میں شروع ہوچکی ہے۔اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن دنیا کی حالت بالکل ٹھیک نہیں ہے۔اس لئے گزرے ہوئے دن کے نعرے گزرے ہوئے دن کے گیتوں کی طرح ہو جاتے ہیں۔ان کو سنا جاتا ہے، ان کو استعمال کیا جاتا ہے اور وہ اس طرح جذبات ابھارتے ہیں اور ان میں تموج پیدا کرتے ہیں جیسے کہ ''طلسماتی شام'' یا ''رات کے اجنبی'' جیسے گانے میرے جیسے بوڑھے شخص کے دل میں جذبات موجزن کرتے ہیں۔لیکن میرا خون ان سے نہیں گرمائے گا جیسا کہ وہ ۱۹۵۰ء کے عشرہ میں برکلے میں اور ۱۹۴۰ء کے عشرہ میں جنیوا میں گرمایا تھا جب میں نے وہاں انہیں سنا تھا۔اس قسم کے الفاظ مثلاً ''بندونگ کا جذبہ''۔''غیر وابستگی'' اور ''آزاد دنیا'' اب بھی جذبات کو ابھارتے ہیں لیکن گرم جوشی ختم ہوگئی ہے اس لئے کہ واقعات نے ان پر غلبہ حاصل کرلیا ہے۔ نئے نوآبادیاتی نظام کے نہ نظر آنے والے ہاتھ کے بارے میں مشتعل ہونا بے معنی ہے۔جبکہ جدید اور برہنہ نوآبادیاتی نظام دنیا کے مختلف حصوں میں رونما ہورہا ہے۔اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ ناوابستگی کا زور ٹوٹ چکا ہے۔ناوابستگی کا زور اس سے زیادہ نہیں ٹوٹا ہے کہ جس قدر کہ سرمایہ دارانہ نظام اور بین الاقوامی کمیونزم کا زور ٹوٹ گیا ہے۔ناوابستگی کی تحریک اس سے زیادہ بے حال نہیں ہوگئی ہے جس قدر کہ سرد جنگ کا واقعی خاتمہ ہوگیا ہے یا دیوار برلن مسمار ہو گئی ہے۔

بحران کے حل کرنے کا انگریزوں کا اپنا پراسرار یا عجب طریقہ ہے وہ شاذونادر ہی بہت زیادہ ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔سر فرانسیس ڈریک نے ہسپانوی بحری بیڑے (اسپینش آرماڈا) کی آمد پر جس ردعمل کا اظہار کیا تھا وہی جذبہ بنیادی طور پر داخلی اور خارجہ تنازعات کے معاملہ میں برطانوی رویہ پر چھایا رہتا ہے۔یہ اچھی سیاست ہے

Copyright © www.bhutto.org

کہ بہت زیادہ ردعمل ظاہر کرنے سے باز رہا جائے اور بہت زیادہ کشت وخون کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ اینڈریو ینگ تنقید کرتا تھا لیکن بیرونی بحران کا اکثر حل اسے خیر باد کہہ دینے ہی میں ہوا کرتا ہے۔ انگریزوں کو ''ڈیوولیوشن'' پارلیمنٹ سے دوسرے اداروں کو کام کی منتقلی جیسے الفاظ اختراع کرنے کا بھی ملکہ ہے۔ جب ''فیڈریشن'' (وفاق) جیسے الفاظ جامد ہو جاتے ہیں۔ کون جانتا ہے کہ ایک عشرہ کے اندر ہی برطانیہ ایک فیڈریشن بن جائے اور ایوان امراء کی جگہ وفاق سینیٹ لے لے۔ وفاقی جمہوریہ جرمنی کا معجزہ عام آدمی کی محنت اور نظم وضبط کا معجزہ تھا۔ ایک اور شکست کے خوف سے مغلوب ہو کر جرمن عوام نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ شکست اور ذلت کو فتح اور عزت میں تبدیل کر دیں گے۔ یہ ایک شکست خوردہ قوم کی بحالی تھی۔ جرمن عوام ایک قابل تعریف مقصد حاصل کرنے کے بعد اب تھوڑا آرام کرنا چاہتے ہیں۔ جرمنی کا نوجوان سخت محنت کے نظم وضبط پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے لگا ہے۔ نوجوان نسل کا ایک طبقہ اگر کاہلی کو نہیں تو کم از کم آرام کرنے کو اچھا تصور کرنے لگا ہے۔ نوجوان نسل کا یہ طبقہ انگریزوں کی سستی یا کاہلی کو اچھا سمجھنے لگا ہے جبکہ پرانی نسل اس سے نفرت کرتی تھی اور فرانسیسی تو پہلے ہی تن آسانی پر یقین رکھتے ہیں۔

اس قسم کی خصوصیات کا ارتقاء کس طرح مغربی یورپ کے لاوارث نظام کی ضروریات کی تکمیل کرے گا۔ خصوصاً جبکہ نوآبادیات ختم ہوتی جارہی ہیں۔ کیا مغربی یورپ اور امریکہ کے اندر کا گہرا بحران نوآبادیاتی نظام کی ایک جنگجویانہ شکل اختیار کرے گا جیسا کہ صدر قذافی نے زائرے میں غیرملکی آپریشن کے بعد حال ہی میں کہا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ تیسری دنیا کے وسائل کو کنٹرول کرنے کی یہ آخری بے تحاشا کوشش فوجی مداخلت کے ذریعہ ہوگی اور تیسری دنیا کی پٹھو حکومتوں کی طرف سے

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

ہوگی؟ شاید ایسا ہی ہو۔ تاہم ڈپلومیسی کا ایک جدید طریقہ نئے قواعد کے ساتھ ۱۹۷۳ء کی رمضان جنگ کے بعد مشکل ہو رہا ہے اور تیل کی قیمتوں میں یکا یک اور بہت زیادہ اضافہ کے باعث توجہ کا باعث بنا ہے۔ تیل کی قیمتوں میں یکا یک اضافہ کے باعث دنیا بھر کی اقتصادیات شدید بحران اور عدم توازن کا شکار ہو گئی ہیں۔ شمال جنوب کی تفریق زیادہ وسیع ہو گئی ہے اور اس کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ الکنا ؤیا اقوام متحدہ کے خصوصی اجلاس کی پیرس کانفرنس کی طفل تسلیوں کے بعد آئندہ مہینہ سات صنعتی ممالک کی بون میں کانفرنس ہوگی۔ برطانیہ کے وزیر اعظم کیلاہن نے کہا ہے کہ شمال اور جنوب کے درمیان سمجھوتہ کرانے کی کوشش کی جائے گی۔ ماضی کے تجربہ کے پیش نظر مجھے شبہ ہے کہ آیا کوئی قابل قدر یا ٹھوس نتیجہ جولائی ۱۹۷۸ء کی بون کانفرنس سے برآمد ہوگا۔ یہ کانفرنس بھی ماضی کی کانفرنسوں کی طرح بے سود اور بے نتیجہ رہے گی۔ رد و بدل یا سمجھوتہ کرنے کے عزم کا فقدان ہے۔ اس کے علاوہ بڑی صنعتی طاقتیں یہ محسوس کرتی ہیں کہ ان کی اپنی اقتصادیات اس قدر شدید مشکل میں مبتلا ہیں کہ وہ اس بات کو کہیں زیادہ ترجیح دیں گی کہ گھر پر ہی سخاوت کریں۔ یہی نکتہ تو وہ نہیں سمجھتی ہیں۔ تیسری دنیا خیرات نہیں مانگتی ہے۔ تیسری دنیا اپنا حق طلب کرتی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کا خاتمہ سرد جنگ کی محاذ آرائی کی ابتداء سے ہوا۔ سرد جنگ کی محاذ آرائی کی جگہ دیتانت نے لے لی۔ اس وقت ہمیں دیانت کے ساتھ مایوسی کی اٹھتی ہوئی لہر کا سامنا ہے۔ مئی کے آخر میں صدر کارٹر کی شکاگو میں پریس کانفرنس اور انا پولیس میں ان کی حالیہ تقریر سے ظاہر ہوگا کہ بین الاقوامی طاقت کا کھیل نیم محاذ آرائی یا نیم دیتانت میں تبدیل ہو رہا ہے جس کا انحصار اس زور پر ہے جو ان کیلئے

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

استعمال کیا جارہا ہے۔میں نے اپنی کتاب ''متھ آف انڈی پینڈینس'' (آزادی کا واہمہ) میں اس صورت کو نظر میں رکھا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ موجودہ تصورات کے خاتمہ کا اور ترجیحات کے از سرنو متعین کرنے کا باعث ہو۔ دو پارٹیوں والا ڈھانچہ جس کی تبلیغ میں نے تیسری دنیا کیلئے کی تھی اور جس کو پاکستان کے واسطے وضع کیا تھا ہوسکتا ہے کہ اس کا از سرنو جائزہ لیا جائے۔ ناوابستگی کی دیتانت کے زمانہ میں گرتی ہوئی قدر و قیمت نیم محاذ آرائی یا نیم دیتانت میں جزوی طور پر بحال ہوگئی ہے۔ اس کے برعکس وابستگیوں کو از سرنو قوی کیا جاسکتا ہے۔

جب میں پاکستان کی قسمت کا نگراں تھا تو ۱۹۷۹ء کے وسط میں مَیں نے ان خاص قوتوں کے بارے میں ابتدائی تبصرہ کیا تھا جو عالمی سطح پر سرگرم عمل تھیں۔ پھر ۱۹۷۶ء اور ۱۹۷۷ء میں کئی مواقع پر میں نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ میں نے اپنے ہم وطنوں سے کہا تھا کہ تین خوفناک قوتیں سرگرم عمل ہیں جو کبھی تو ایک دوسرے سے مقابلہ کرتی ہیں کبھی ایک دوسرے سے تنازعہ کرتی ہیں کبھی ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتی ہیں اور کبھی ایک دوسرے کے ساتھ محاذ آرائی کرتی ہیں۔ یہ قوتیں مذہب، کمیونزم اور نیشنلزم (وطنیت) ہیں یہ تین نظریات افراد اور قوموں کے ذہن کو متاثر کررہے ہیں۔ میں نے اپنے ہم وطنوں سے کہا تھا کہ بجائے اس کے کہ ہم چمکدار زرہ بکتر پہن کر کسی ایک نظریہ کیلئے جہاد کریں یہ بات علاقائی، عالمی توازن کے حق میں ہے کہ ہم ان کے مشترکہ پوائنٹس (نکات) میں ہم آہنگی پیدا کریں اور تنازع اور ٹکراؤ والے نکات میں تلخی اور شدت پیدا کرنے سے پرہیز کریں۔ میں نے مزید واضح کیا تھا کہ ہنر تو یہ ہے کہ ایسا رول اس طرح ادا کیا جائے کہ اپنا نظریہ نہ تو کمزور ہو اور نہ ہی اس کے ساتھ وفاداری میں کوئی ردوبدل یا سمجھوتہ

Copyright © www.bhutto.org

کرنا پڑے۔اس کا مطلب ''جیو اور جینے دو'' سے زیادہ ہے۔اس کا مطلب سفید یا کالے رنگ کے مقابلہ میں بھورے رنگ پر زیادہ توجہ مبذول کرنا تھا۔آپ براہِ راست یروشلم کی راہ اختیار نہیں کر سکتے اور وہاں محض اس لئے امن وسکون نہیں پا سکتے کہ وہ ایک مقدس شہر ہے۔افریقہ کے مسئلے کو وہاں سی۔۱۴۱ اطیاروں کے ذریعہ چھاتہ بردار فوج اتار کر حل نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ماؤزے تنگ کی غالب خواہش ایک نئے انسان کی تخلیق تھی۔ایک ایسے نئے چینی کی تخلیق تھی جو انقلاب کے پرچم کو ہمیشہ ہمیشہ بلند رکھے۔سیاسی افق سے دوبارہ غائب ہو جانے والے ٹنگ سیاؤ پنگ اس قسم کا نیا انسان تخلیق کرنے میں مصروف ہیں۔وہ اس سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔انہوں نے اس عظیم کام کو اس صدی کے آخر تک مکمل کرنے کا اپنے آپ کو پابند کیا ہے۔جو لوگ آنے والی تباہی کے خوف سے مغلوب ہیں وہی لوگ اس تباہی کو لانے والے ہیں۔جو لوگ موجودہ صورتحال کے ساتھ گھبراہٹ کے عالم میں چپکے ہوئے ہیں کہ جیسے وہ نا قابل تغیر ہے وہی لوگ موجودہ صورتحال کی جلد تباہی کے ذمہ دار ہیں۔صورت حال میں نا قابل تصور باتیں پیدا ہو رہی ہیں اور کمپیوٹر والی یقینی صورت حال کم ہوتی جا رہی ہے۔آپ کس چیز کا سہارا لیتے ہیں۔یا کس بات پر بھروسہ کرتے ہیں؟ میں عوام پر بھروسہ کرتا ہوں اور ان کے باطنی ردعمل پر اعتماد کرتا ہوں۔لوگ ہی رہنمائی کرتے ہیں اور لوگوں ہی کی رہنمائی کی جاتی ہے۔لیڈر کو عوام کی تمناؤں کا علم ہونا چاہئے اور ان کی تمناؤں کی بنیاد پر عوام کو ایک جرأت مندانہ جہت عطا کرنی چاہئے۔اس معاہدہ میں دھوکہ بازی سب سے زیادہ مہلک ہے۔

میں نے تنازعہ کے حل سے پہلے سمجھوتہ کی ضرورت کے بارے میں ایک سے

زائد بار لکھا ہے۔ تنازعہ کے حل سے پہلے سمجھوتہ غیر معینہ مدت کیلئے نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک نازک و متحرک صورتحال کا مستقل حل نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک عارضی ضرورت ہے۔ عارضی سہل ترکیب یا سہل طریقہ کار نہیں ہے۔ ہمیں اپنے خیالات مجتمع کرنے اور اپنے ذہنوں کو صاف کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں نظریاتی علاقہ دیئے بغیر یعنی اپنے نظریات کو خیر باد کہے بغیر سیاسی جنگ بندی کی ضرورت ہے۔ ہمیں مردہ خیالات کو دفنانے اور تھکن پر غلبہ حاصل کرنے کیلئے جنگ بندی کی ضرورت ہے۔ تنازع کے حل سے پہلے سمجھوتہ باعزت اور برملا ہونا چاہئے۔ دونوں ہی پارٹیوں کو شکست ہوئی ہے یا مجھے یہ کہنا چاہئے کہ کوئی بھی پارٹی جیت نہیں سکتی۔ جنگ بندی کے دوران موجودہ قوتوں کا مجموعہ ایک نیا نظام یا موجودہ قوتوں کے درمیان مساوات تخلیق کرسکتا ہے۔ خواہ فارمولا کچھ ہی ہو اس کو پرانی اور نئی جنگوں کے میدان جنگ میں وضع نہیں کیا جا سکتا۔ نیا بین الاقوامی نظام تیسری دنیا کی سربراہ کانفرنس کے مطالبات کے ذریعہ ہی ابھر سکتا ہے۔ شمال، جنوب کے تنازعہ کا حل (جو مشرق، مغرب کے تنازعہ کے مقابلہ میں زیادہ سنگین ہے) لازمی طور پر نا قابل تنقید دیانتداری کے ساتھ تلاش کیا جانا ہے۔ حقیقی تخفیف اسلحہ کی صورت خود بخود پیدا نہیں ہو جائے گی اور نہ ہی تخفیف اسلحہ کے بارے میں اقوام متحدہ کے خصوصی اجلاسوں میں فرسودہ یا گھسے پٹے تبصروں سے پیدا ہوگی حالانکہ میں ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے سب سے پہلے ۱۸ سال قبل اس قسم کی کانفرنس کی تجویز پیش کی تھی۔ اس وقت میں نے کہا تھا کہ چین اور فرانس کی شرکت کے بغیر تخفیف اسلحہ کے سلسلہ میں کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی جاسکتی ہے۔ ۱۸ سال کے بعد میرا موقف یہ ہے کہ تخفیفِ اسلحہ کی کانفرنس بہت تاخیر سے ہورہی ہے۔ ایک بار پھر واقعات نے بڑی تیزی سے

پیشرفت کی ہے۔

تخفیفِ اسلحہ کی کانفرنسوں کی پناہ میں (جو شاندار کمروں میں منعقد ہوتی ہیں اور جن سے عالمی لیڈر خطاب کرتے ہیں) اسلحہ کا مقابلہ خبط کی حد تک پیدا ہو رہا ہے۔ یہ حد یا سطح خوفناک ہے جس کی کوئی مثال یا نظیر نہیں ہے۔ اس غیر معقول اسلحہ پرستی کی چند خصوصیات کے ذریعہ میں اس صورت حال کی وضاحت کرتا ہوں:۔

(i) ۱۹۷۰ء میں دنیا کی اقوام تقریباً ۲۰۰ ارب ڈالر فوجی اسلحہ پر خرچ کر رہی تھیں۔ جب سے یہ مجموعی رقم ۴۰۰ ارب ڈالر ہوگئی ہے یا ایک ارب ڈالر یومیہ سے زائد کا اضافہ ہوا ہے۔

(ii) دنیا میں باقاعدہ مسلح افواج کا سائز ۱۹۷۸ء میں ۲۳ ملین ہو گیا ہے جو ۱۹۷۰ء کے مقابلہ میں ۲ ملین زائد ہے اور ۱۹۶۰ء کے مقابلہ میں ۷ ملین سے زائد ہے۔

(iii) بڑے صنعتی ممالک غریب ترقی پذیر ممالک کو ۸ ارب ڈالر مالیت کا اسلحہ برآمد کر رہے ہیں جو ۱۹۷۰ء کے مقابلہ میں تقریباً ۳ گنا اور ۱۹۶۰ء کے مقابلہ میں چار گنا ہے۔

(iv) ۱۹۷۰ء کے عشرہ کی ابتداء کے بعد امریکہ اور روس نے اپنے ایٹمی اسلحہ کے ذخائر میں اضافہ کر دیا ہے جو بجائے ۸ ہزار کے ۱۴ ہزار ہو گئے ہیں اور دوسرے ممالک مثلاً برطانیہ، فرانس، چین، بھارت اور شاید اسرائیل کے پاس مزید ۱۵۰۰ ایٹمی ہتھیار موجود ہیں۔

اب تک باوجود ہیجان اور دوسروں کی جنگیں لڑنے کے کسی کو بھی فتح حاصل نہیں

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

ہوئی ہے اور نہ ہی کسی کو شکست ہوئی ہے۔ اگر ہم اسی طرح تذبذب کا شکار رہے تو کسی کو بھی فتح حاصل نہیں ہوگی۔ ہر کوئی خسارہ میں رہے گا۔ ٹھیک ہے۔ یہ بھی ایک حل ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا عالمی لیڈروں نے دنیا کے عوام کو اس صورتحال کے واسطے تیار کیا ہے؟ کانفرنسوں، نیم حلووں یا لکڑ ہاروں اور سقاؤں کا خون چوسنے کا وقت گزر چکا ہے۔ سرخ پرچم کا لہرانا ان لوگوں کو ذرا بھی خوفزدہ نہیں کرے گا جو صدیوں کی غربت کے باعث رنگ ہی کی شناخت نہیں کر سکتے ہیں۔ روڈیشیا جیسے داخلی سمجھوتے ہماری جنگجویانہ لیکن جائز تمناؤں کیلئے ایک توہین ہیں۔

اردگرد کی بے اطمینانی کے سمندر میں موبوتو جنتا کو ڈوبنے سے روکنے کی غرض سے دو سال کے اندر زائرے میں دوسری بار فوجی مداخلت کی گئی ہے جس کو احمقانہ وجوہات کی بناء پر حق بجانب قرار دیا جا رہا ہے۔ مداخلت کا سبب اس قدر کمزور ہے کہ فرانسیسیوں کی فرانسیسی منطق نا قابل یقین ثابت ہوگئی ہے۔ یہ بات بار بار کہی گئی ہے کہ موبوتو کا کوئی بھی متبادل موبوتو سے بہتر ہے۔ اس عجیب قسم کے ڈکٹیٹر کو بیرونی فوجی مداخلت کے ذریعہ دوبار عوام کے انتقامی غیض وغضب سے بچالیا گیا ہے۔ پھر بھی اس نے حال ہی میں بڑی بے باکی کے ساتھ اعلان کیا ہے کہ وہ ایسی کسی بھی مغربی کوشش کو مسترد کر دے گا جو زائرے میں پھیلی ہوئی عام بدعنوانی اور رشوت ستانی کو ختم کرنے پر اصرار کرے گی یا امداد حاصل کرنے کی شرط کے طور پر انسانی حقوق کے بارے میں اصلاحات پر زور دے گی۔ جنرل موبوتو نے کہا کہ ''اس کا جواب نفی میں ہے اور قطعی نفی میں ہے، میں سِنگ سِنگ میں قیدیوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا ہوں۔ آپ یہ کیوں قبول کرتے ہیں کہ وہ میرے داخلی معاملات میں مداخلت کریں۔'' یہ جنرلوں کے اور فوجی جنتا کے نفرت انگیز دوہرے معیار ہیں

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

جنہوں نے عوام کو ان سے نا قابل تنسیخ حد تک متنفر اور بے زار کر دیا ہے۔ کولویزی کی فضاء میں سفید اور سیاہ فاموں کے قتل عام کی بد بو ابھی مشکل سے ہی حل ہو پائی تھی کہ موبوتو کی جانب سے شابا کے تانبے سے مالا مال صوبہ میں غیر ملکی فوجی انقلابیوں کا پیچھا کر رہے ہیں اور انہیں ٹھکانے لگا رہے ہیں جبکہ موبوتو بدعنوانی اور رشوت ستانی سے نجات حاصل کرنے کیلئے اور انسانی حقوق کا دفاع کرنے کیلئے غیر ملکی مداخلت کی مذمت کرنا درست خیال کرتا ہے۔ ہر شخص کے بارے میں اس کے احباب کی بناء پر رائے قائم کی جاتی ہے۔ یہ بات فضول نہیں کہی گئی ہے کہ ''مجھے بتائیں کہ آپ کے دوست کون ہیں اور میں آپ کو بتاؤں گا کہ آپ کیا ہیں۔'' شکست تسلیم کئے بغیر تنازع کے حل سے قبل سمجھوتہ یا مفاہمت ہونا چاہئے۔ تاکہ نئے اور منصفانہ اقدار کی بنیاد پر دنیا کے نظام کا از سر نو ڈھانچہ تیار کیا جا سکے۔ یہ آخری موقع ہے اگر در حقیقت آخری موقع بھی ہماری انگلیوں میں سے ہو کر پہلے ہی پھسل نہیں گیا ہے یعنی ہمارے ہاتھوں سے نکل نہیں گیا ہے۔

اس وسیع ڈھانچہ کی گنجائش کے اندر ہمیں اپنی توجہ برصغیر ہند اور ایشیا پر مرکوز کرنی چاہئے۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ آبادی میں بے تحاشا اضافہ یا غربت نہیں ہے اور نہ ہی ٹیکنالوجی کی کمی یا عدم موجودگی ہے۔ ان پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم اپنے عوام کو صحیح طور پر استعمال کریں اور ان کی صحیح سمت میں رہنمائی کریں۔ ہمارے عوام منظم اور متحرک ہو جائیں گے اگر ان کو پوری طرح شریک کیا جائے اور ان کو پوری طرح شرکت کیلئے تیار کیا جائے۔ عوام کی غیر استعمال شدہ توانائیوں کو کام میں لانے کیلئے اور انہیں دولت میں وافر حصہ دینے کیلئے اور مستقبل میں امید دلانے کیلئے یہ ضروری ہے کہ صحیح نظام ہو اور صحیح خیالات ہوں۔ جی این پی

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

کی مجنونانہ دوڑ اور آئی ایم ایف کے ساتھ دینے والے قرضے کافی نہیں ہوں گے۔ یہ قطعی طور پر ناکافی ہیں۔ ہمارا چھوٹے پیمانہ پر مسئلہ وہی ہے جو دنیا کا وسیع پیمانہ پر ہے۔ صرف حل تاریخی اور جغرافیائی تبدیلیوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ ہمارے مسائل کے حل کیلئے سب سے زیادہ خوفناک خطرہ فوجی جنتاؤں سے ہے جو مارشل لاء کے کوڑے پر انحصار کرتے ہیں۔ کیا فوجی جنتا کی اس شکل اور بین الاقوامی سیاسی جنتا کے درمیان کوئی متوازی خط کھینچا جا سکتا ہے؟ فرق یہ ہے کہ بین الاقوامی سیاسی جنتا ظالم اور غیر تربیت یافتہ فوجی جنتا کے مقابلہ میں زیادہ ذہین اور محتاط یا چوکس ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کہنے کی ترغیب ناقابل مزاحمت ہو کہ وہ دونوں بالکل ایک ہیں لیکن اس قسم کا مؤقف اختیار کرنا بہت زیادہ مبالغہ آمیزی پر مبنی ہوگا۔ بیشک کچھ سطحی اور غیر اہم قسم کی یکسانیت تو دونوں میں پائی جاتی ہے اس لئے کہ دونوں ہی استحصال کرنے والے ہیں اور دونوں کا تعلق حکمراں ٹولہ سے ہے لیکن بنیادی طور پر یہ یکسانیت یا مشابہت منطقی طور پر مناسب اور جائز نہیں ہے۔

ایشیا کے منظر پر وطنیت یا قومیت ہر شے پر چھا جانے والی ہے اس وطنیت کا سب سے نازک پہلو اس میں کمیونزم کا مقام نہیں ہے۔ سب سے زیادہ نازک پہلو اس کے ڈھانچہ کے اندر ذیلی وطنیت یا قومیت کا مقام ہے۔ یہ مسئلہ ازسرنو پیدا ہوا ہے اور زیادہ شدت سے پیدا ہوا ہے نہ صرف ایشیا میں بلکہ یورپ اور کینیڈا میں بھی اور بظاہر افریقہ میں بھی۔ مغربی یورپ میں یہ برطانیہ اور اسپین میں ظاہر ہوا ہے۔ یہ صرف دو مثالیں ہیں۔ مشرقی یورپ میں اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال یوگوسلاویہ میں پائی جاتی ہے۔ کینیڈا میں یہ کیوبک میں موجود ہے۔ یہ ایک انوکھی صورتحال ہے۔ ایک طرف تو دنیا ذرائع مواصلات اور دوسرے ذرائع کی بھرمار

کے باعث سکڑتی جارہی ہے۔یکجا ہونے کا جذبہ مضبوط تر ہوتا جارہا ہے۔انضمام اور علاقائی تعاون کی جانب رجحان میں تیزی پیدا ہورہی ہے۔ہم اسے یورپی مشترکہ منڈی کی شکل میں یورپ کی پارلیمنٹ کے مطالبہ میں اواے یو اور ایشیئن کی شکل میں۔اسلامی سیکریٹریٹ کی تخلیق میں دیکھتے ہیں۔اس کے برعکس نسلی اور لسانی انا یکجا ہونے کا جذبہ کے اندر اپنے تشخص پر زور دینے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔

ایک وقت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وفاق متضاد دعوؤں کا حل ثابت ہوگا۔وفاق اب بھی ذیلی قومیت کا لازمی حل ہے لیکن کچھ مقامات پر وہ ناکافی ثابت ہورہا ہے۔شاید یہاں بھی جذبہ اور خواہش نے حل سے آگے پیش رفت کرلی ہے۔کچھ مقامات میں مسئلے کا حل وقت سے پہلے ہوگیا ہے اور دوسرے مقامات میں تاخیر سے ہوا ہے۔اس کا اطلاق بھی خراب طریقہ سے اور بے ایمانی کے طریقہ سے کیا گیا ہے۔نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وفاقی حل میں اعتماد متزلزل ہوگیا ہے لیکن ذیلی قومیتوں کے جذبہ کی تسکین کیلئے اس سے زیادہ معاندانہ بات اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ فوجی جنتا کا غلبہ ہو۔اسی فضا میں ذیلی قومیتوں کے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھارتے ہیں۔جذبہ کی محرومی انتہائی عروج کو پہنچ جاتی ہے۔اگر ذیلی قومیت یا وطنیت ایشیائی وطنیت یا قومیت کا سب سے سنگین مسئلہ ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ فوجی حکومت ایشیائی وطنیت یا قومیت کی بدترین دشمن ہے۔یہ عوام کو حکومت میں شرکت سے محروم کرتی ہے۔اس سے ذیلی قومیتوں کی انا کو سب سے زیادہ ٹھیس پہنچتی ہے۔وہ عوام کو نمائندگی کے حق سے محروم کرتی ہے۔اس سے ذیلی قومیتیں سب سے زیادہ برگشتہ ہو جاتی ہیں۔اس دور میں ذیلی قومیتیں محسوس کرتی ہیں کہ انہیں دھوکہ دیا گیا ہے اور انہیں گمراہ کیا گیا ہے۔اسی دور میں ذیلی قومیتیں یہ خیال کرنے لگتی ہیں کہ ان کی

Copyright © www.bhutto.org

آزادی اوران کےحق خودارادی کوجھوٹے وعدوں کے ذریعہ دھوکہ سے سلب کیا گیا ہےاوران جھوٹے وعدوں ہی کے باعث انہوں نےعظیم تر قومی تشخص میں شمولیت اختیار کی تھی۔ٹھوس معنی میں تعلق کا فیصلہ کن پہلوخودمختاری اورخودمختاری کی زیادہ سے زیادہ مقدار میں ہے۔

اگراس مسئلے کا کوئی اطمینان بخش حل نکل آتا ہےاوراگر وہ حل یا سمجھوتہ منصفانہ طور پر کام کرتا ہےتو ایشیائی وطنیت یا قومیت کو جوخطرہ لاحق ہوتا ہےختم ہو جاتا ہے یا کم ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں نیشنلزم خودمختاری کے ڈھانچہ پر پلتا بڑھتا ہے۔فوجی حکومت ایک ہی وار میں خودمختاری کوتباہ کر دیتی ہے۔جیسے کہ ٹڈی دل کھڑی فصلوں کو ایک ہی حملہ میں تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ ذاتی طور پرحق جتانے سے محرومی ذیلی قومیتوں کومشتعل کر دیتی ہے۔خودمختاری کے ذریعہ انضمام کے بجائے وہ علیحدگی کی جدوجہد میں مصروف ہوکر انتشار کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔اس لئے خودمختاری کی محرومی قومی اتحاد کے استحکام کا باعث نہیں ہوتی بلکہ اس کی تباہی و بربادی کا باعث ہوتی ہے۔ جاپان جیسے ایک ہی قوم والے ملک تو مستثنیات میں سے ہیں۔چین نے بھی اپنی ذیلی قومیتوں کے مسئلے کا حل اپنے طور پر تلاش کرلیا ہے۔اس نے ایسا پارٹی کے نظریہ اورخودمختاری کے ذریعہ کیا ہے۔ برما نہایت دولت مند ملک مشہور تھا وہ قیمتی پتھروں اور خام مال سے بھرا پڑا تھا۔ برما ہر سال لاکھوں ٹن چاول برآمد کیا کرتا تھا۔ آج برما ایک عظیم بحران سے دو چار ہے۔صدر نے ون نے آزادی کی جنگ لڑی ہےاوروہ ایک غیر معمولی طور پر ذہین شخص ہےلیکن اس نے برما کوفوجی جنتا کے تحت طویل عرصہ تک رکھا۔جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوا۔ میں یہ بات افسوس کے ساتھ کہہ رہا ہوں اس لئے کہ نے ون میرا ذاتی دوست ہے۔اس نے اپنی دوستی کا اظہار ۱۹۶۷ء

Copyright © www.bhutto.org

میں کیا تھا جب ایوب خان کا فوجی جنتا مجھے تنگ کر رہا تھا۔ میں یہ دکھانے کیلئے ایک غیر جانبدارانہ تجزیہ کر رہا ہوں کہ فوجی جنتا کی حکومت کس طرح ملک کو تباہ و برباد کرتی ہے۔ انڈونیشیا کے مسئلہ کو سوئیکارنو نے سیاسی چابکدستی اور سیاسی کامیابیوں کے ساتھ بڑی دانشمندی سے حل کیا ہے تاہم یہ مسئلہ انڈونیشیا میں اب بھی باقی ہے۔

صدر سوئیکارنو انڈونیشیا کے بانیوں میں سے تھے۔ انہوں نے مختلف جزائر کو متحد کیا اور ان کے باشندوں کو انڈونیشی قوم بنا دیا۔ انہوں نے اپنے عوام کو ایک مشترکہ زبان دی اور رومن رسم الخظ عطا کیا۔ صدر سوئیکارنو نے عورتوں کو پابندیوں سے نجات دلائی۔ انہوں نے ایک ناٹو میں شامل ملک اور آسٹریلیا کی مخالفت کے باوجود مغربی ارٹین کو آزاد کرایا۔ وہ بندونگ کانفرنس کے روحانی باپ تھے۔ انہوں نے انڈونیشیا کے عوام کو وقار عطا کیا اور انڈونیشیا کو ایشیا کا ایک سربرآوردہ ملک بنا دیا۔ سوئیکارنو کمیونسٹ نہیں تھے لیکن انہوں نے روس اور چین کے ساتھ قریبی دوستانہ تعلقات کو فروغ دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ امریکہ کا بہت احترام کرتے تھے اور صدر جان ایف کینیڈی کیلئے ان کے دل میں بڑی گرمجوشی کے جذبات تھے۔ ان معلوم عناصر کے باوجود چین کے ساتھ ان کے قریبی تعلقات ان لوگوں کو ناگوار تھے جو یہ خیال کرتے تھے کہ چین ایک خطرہ ہے۔ چونکہ چین سے دوستی کرنا ایک گناہ خیال کیا جاتا تھا اس لئے اس گناہ کے ارتکاب کرنے والے کو لازمی طور پر سیاسی منظر سے ہٹا دینا ضروری تصور کیا جاتا تھا۔ اس لئے سوئیکارنو کے خلاف ایک زبردست پروپیگنڈہ مہم شروع کی گئی۔ ان کے بارے میں عام سی کہانیاں گردش کرنے لگیں کہ انڈونیشیا کی اقتصادیات گڑبڑ کا شکار ہیں۔ افراطِ زر کی شرح ناقابل برداشت ہے۔ سوئیکارنو چین کے پٹھو ہیں۔ وہ انڈونیشیا کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ خانہ جنگی

دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ انڈونیشیا کو بچانا ہے۔ انڈونیشیا کو جنرل سوہارتو اوران کی فوجی جنتا نے ۱۹٦٦ء میں گویا تباہی سے بچالیا۔

۱۹۷۸ء میں انڈونیشیا کی کیا حالت ہے جبکہ جنرل سوہارتو اوران کی فوجی جنتا کو ملک کو بچائے ہوئے ۱۲ سال گزر گئے ہیں۔ جنرل عبدل ہارس نسوشن کے الفاظ میں جنہوں نے سوئیکارنو کو اقتدار سے محروم کرنے میں سوہارتو کی مدد کی تھی'' سماجی حالات ایک آتش فشاں کی مانند ہیں۔صورتحال اس قدر دھماکہ خیز ہے کہ ایک چھوٹا سا واقعہ ایک بڑی گڑ بڑ کا باعث ہوسکتا ہے۔''

انڈونیشیا جو ایک دولت منداور زرخیز ملک کی شہرت رکھتا تھا۔ اب ڈھائی ملین ٹن سے زائد چاول درآمد کررہا ہے۔ ملک کے اہم پیٹرولیم کے وسائل یا ذخائر ختم ہو رہے ہیں۔ سوئیکارنو کے انتہائی نازک دور میں جس قدر بدنظمی اور بدعنوانی تھی اس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بے چینی اور بے اطمینانی، بدعنوانی اور بدانتظامی، ظلم اور طلباء ایجی ٹیشن اس وقت انڈونیشیا میں موجود ہے۔ ملک کی تیل کی کمپنی تمینیا ۱۰ء۴ارب ڈالر کی مقروض ہوگئی ہے جس کے باعث انڈونیشیا کی اقتصادی بقا ہی خطرہ میں پڑ گئی ہے۔ اس قسم کی صورتحال سوئیکارنو کے زمانہ میں نہیں ہوئی تھی حالانکہ سوئیکارنو پر الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے ملک کی اقتصادیات کو گڑ بڑ کی نذر کر دیا ہے۔ جب سوئیکارنو انڈونیشیا کے صدر تھے تو انڈونیشیا کی یونیورسٹیوں میں کبھی فوج کا قبضہ نہیں ہوا۔ سوئیکارنو کی صدارت کے زمانہ میں انڈونیشیا کی فوج کو مغربی ارٹین کو آزاد کرانے کیلئے استعمال کیا گیا۔ ملائیشیا کے ساتھ محاذ آرائی کی حمایت کرنے کیلئے استعمال کیا گیا اور ۱۹٦۵ء کی جنگ میں بھارت کے خلاف پاکستان کی حمایت میں استعمال کیا گیا۔

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

سوہارتو کی فوجی جنتا کی حکومت کے زمانہ میں انڈونیشیا کی مسلح افواج کو عوام کے خلاف کر دیا گیا ہے۔ انہیں ملک کے نوجوانوں، صحافیوں اور دانشوروں کے خلاف کر دیا گیا ہے۔ جنرل ہارتونو دھارسوتو نے (جو ایک ممتاز سفارتکار ہیں اور فوجی جنتا سے بددل اور مایوس ہو گئے ہیں) اس مہینہ حالیہ احتجاجات کے اسباب کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ ''اصل سبب قیادت کی اقتصادی پالیسی سے بے اطمینانی ہے جو بہت زیادہ جی این پی کی حامی اور طرفدار ہے اور دولت کی مساوی تقسیم پر یقین نہیں رکھتی۔ پھر بدعنوانی اور رشوت ستانی ہے اور جمہوریت کا فقدان ہے۔ میں فوج کے حالیہ کردار سے واقعی پریشان ہوں۔ طلبہ پر فوج کے حالیہ حملے جو قطعی طور پر غیر مسلح تھے اس نئی سخت پالیسی کا بظاہر نتیجہ تھے، فوج کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ عوام میں سے ہے اور عوام ہی کے واسطے ہے لیکن اس قسم کی کارروائی سے تو فوج عوام سے دور ہو جائے گی اور عوام اس سے نفرت کرنے لگیں گے۔''

سوشلسٹ نظریات کے حامی سوئیکارنو کے زوال کے بعد اور آزاد انٹر پرائز کے حامی سوہارتو کے برسر اقتدار آنے کے بعد یہ خیال تھا کہ انڈونیشیا میں غیر ملکی سرمایہ کاری کثرت سے ہوگی۔ سوہارتو کی ''مستحکم'' حکومت کے بارہ سال بعد صورتحال یہ ہے کہ غیر ملکی سرمایہ کار انڈونیشیا کے باہر نظریں دوڑا رہے ہیں۔ جکارتہ میں ایک غیر ملکی سرمایہ کار نے شکایت کرتے ہوئے کہا کہ ''انڈونیشیا میں کوئی بات منطقی نہیں ہے۔ میں مستقبل میں غیر ملکی سرمایہ کاری کے بارے میں خاصا مایوس ہوں، اور خود ملک کے مستقبل کے بارے میں مایوس ہوں۔''

سوئیکارنو کے دور کے مقابلہ میں اب زیادہ رشوت ستانی ہے۔ زیادہ بے روزگاری ہے اور زیادہ بے اطمینانی کی کیفیت ہے۔ افراط زر کو کنٹرول کرنے اور

جی این پی میں اضافہ کرنے کے بارے میں جو لمبے چوڑے دعوے کئے جا رہے ہیں اس کے باوجود زرعی اور صنعتی پیداوار میں اضافہ نہیں ہوا ہے گو کہ اس میں کمی بھی نہیں ہوئی ہے۔ غیر ملکی سرمایہ کار ملک سے باہر جا رہا ہے۔ اقتصادیات کی حالت زیادہ ابتر ہے۔ طلبہ مشتعل ہیں۔ دانشور ناامید اور مایوس ہیں۔ عوام اپنی ہی فوج سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ قومی تفاخر جس میں سوئیکارنو کے زمانہ میں اضافہ ہوا تھا اب اس میں بہت زیادہ کمی واقع ہوئی ہے۔ سیاسی اور اقتصادی بے اطمینانی کسی بھی لمحہ ایک بغاوت کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ پہلے کے مقابلہ میں انڈونیشیا میں کمیونزم زیادہ مضبوط و مستحکم ہے۔

میں سوہارتو کو ذاتی طور پر پسند نہیں کرتا ہوں۔ درحقیقت اپریل ۱۹۶۶ء میں جب میں آدم ملک کی درخواست پر صدر سوئیکارنو کا جکارتا میں مہمان تھا تو میں نے صدر سوئیکارنو کو یہ ترغیب دینے میں معمولی سا کردار ادا کیا تھا کہ وہ جنرل سوہارتو کے ساتھ کھلی محاذ آرائی کرنے کی غرض سے جو منصوبے بنا رہے ہیں ان کو انڈونیشیا کی خاطر اور ایک اور قتلِ عام کو روکنے کی غرض سے ترک کر دیں۔ صدر سوئیکارنو نے آدم ملک کی موجودگی میں عشائیہ کے موقع پر مجھ سے کہا تھا کہ صرف میں ہی انہیں ان کے فیصلہ کو تبدیل کرنے کی کامیاب ترغیب دے سکتا تھا۔ عشائیہ کے بعد آدم ملک نے مجھ سے کہا تھا کہ انڈونیشیا کے عوام میرے ہمیشہ شکرگزار رہیں گے کہ میں نے صدر سوئیکارنو کو ان کا فیصلہ تبدیل کرنے کی ترغیب دی ورنہ ایسا کشت و خون ہوتا کہ جس کی نظیر نہیں مل سکتی تھی۔ میں نے ایسا نیک جذبات کے ساتھ کیا تھا۔ لیکن انڈونیشیا کی موجودہ صورتحال تسلی بخش نہیں ہے۔ فوجی جنتا نے دنیا کے ایک امیر ترین ملک کو تباہ کر دیا ہے۔

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

پاکستان اور انڈونیشیا کی صورت حال کے درمیان یکسانیت حیرت انگیز ہے فرق یہ ہے کہ پاکستان دنیا کے غریب ترین ممالک میں سے ہے۔ اگر بارہ سال کے عرصہ میں فوجی جنتا دنیا کے ایک امیر ترین ملک کو تباہ کرسکتی ہے تو اس امر کا اندازہ لگانے کیلئے کچھ زیادہ تخیل کی ضرورت نہیں ہے کہ فوجی جنتا ایک ہی سال میں دنیا کے غریب ترین ملک کے ساتھ کیا کچھ کرسکتی ہے۔ انڈونیشیا اور پاکستان دونوں ہی ایشیا میں ہیں۔ دونوں مسلم ممالک ہیں۔ دونوں میں فوجی جنتا کی حکومت ہے۔ دونوں ہی جنتاؤں نے مقبول قیادت کی جگہ سنبھالی ہے۔ دونوں مقبول لیڈروں کی یہ شہرت تھی کہ وہ چین کے اور سوشلسٹ نظریات کے حامی ہیں۔ دونوں ہی عوام کی طاقت اور اپنے ممالک کی عظمت وشان پر یقین رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے انڈونیشیا کے بارے میں قدرے تفصیل سے لکھا ہے۔ میرا مقصد صدر سوہارتو کو ناراض کرنا نہیں ہے۔ سوئیکارنو کی موت کے ۸ سال بعد سوہارتو نے مجبور ہو کر اس شخص کو انڈونیشیا کا ہیرو تسلیم کیا ہے جس کی حکومت کا تختہ انہوں نے الٹا تھا۔ کیا پاکستان کی فوجی جنتا مجھے اس لئے ہلاک کرنا چاہتی ہے کہ میرے مرنے کے بعد وہ مجھے خراج عقیدت پیش کرے؟

ذیلی نیشنلزم ملائیشیا میں زیادہ سنگین نوعیت کا پایا جاتا ہے لیکن ملائیشیا میں اس پر قابو پانے کیلئے سیاسی کوششیں کی جارہی ہیں۔ اب ہم ہندوستان کو لیتے ہیں بھارت میں فیڈریشن (وفاق) کئی اسباب کی بناء پر قائم ہے۔ ۱۹۵۲ء کے بھارتی آئین کے ذریعہ اتحاد کے مسئلے کا وفاقی حل تلاش کیا گیا تھا۔ سوائے ڈیڑھ سال کے عرصہ کے جس میں ۱۹۷۵ء میں مسز گاندھی نے ہنگامی حالت نافذ کی تھی، بھارت میں جمہوری حکومت رہی ہے۔ جس میں عوام کی پوری طرح شرکت ہے۔ مجموعی طور پر صوبائی

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

خودمختاری کا احترام کیا گیا ہے۔ بھارت میں فوج نے ابھی تک اپنے آپ کو سیاست میں ملوث نہیں کیا ہے۔ بھارتی قیادت نے اس حساس معاملہ کے احترام میں خاصی ذہانت کا مظاہرہ کیا ہے۔ بھارتی عوام خصوصاً ہندو علاقائی نیشنلزم کیلئے احترام کے جذبات رکھتے ہیں۔ گاندھی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اگر بھارت میں مسلمانوں کا وجود ختم ہو جائے تب بھی اسلام دوسرے ممالک میں رہے گا لیکن اگر ہندوؤں کا نام ونشان بھارت سے مٹ جائے تو ہندو مذہب تباہ ہو جائے گا۔ بھارت کا اتحاد ہندو مذہب اور خودمختاری کی بقاء کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ ہندوؤں کا مذہبی فریضہ ہے کہ وہ بھارت کو متحد رکھیں۔ بھارت ماتا کا تخیل اور بھارت ماتا کی تقسیم پر غم وغصہ اورنفرت کا اظہار انہی جذبات کے باعث ہے۔

بھارت کے اتحاد کا انحصار بہت سے چھوٹے اور بڑے صوبوں کے وجود پر ہے۔ ایک صوبہ باقی بھارت پر اپنا سایہ نہیں ڈالتا ہے۔ اور نہ ہی مسلح افواج یا سول سروس میں یا اقتصادیات پر کسی ایک صوبہ کی اجارہ داری ہے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک بھارتی اتحاد کو مستحکم کرنے کیلئے پاکستان کی جانب سے نام نہاد خطرہ کو استعمال کیا گیا۔ ۱۹۶۲ء کے بعد چین کی جانب سے خطرہ کو بھی اس چیلنج میں شامل کر دیا گیا جو بھارتی اتحاد کو درپیش تھا۔ ۱۹۷۱ء کے بعد بھارتی اتحاد کو مستحکم کرنے کا طریقہ بھارتی جنگجو یانہ وطن پرستی ہے جس میں ایٹمی حیثیت کا دعویٰ اور برصغیر میں غالب قوت ہونے کا دعویٰ شامل ہیں۔ بھارتی لیڈر اس بارے میں بھی پروپیگنڈہ کرتے ہیں جس کو وہ ''پاکستان کی ناکامی'' کا نام دیتے ہیں۔ وہ بھارتی جمہوریت کا پاکستان میں فوجی ڈکٹیٹر شپ سے موازنہ کرتے ہیں۔ اسکے علاوہ اپنی محدودات کے باوجود بھارت نے کافی اقتصادی ترقی کی ہے۔ وہ اناج کے معاملہ میں خودکفیل ہو گیا ہے۔

Copyright © www.bhutto.org

یہ کوئی معمولی کامیابیاں نہیں ہیں۔

لیکن ان کامیابیوں کے باوجود میں اب بھی کہوں گا کہ بھارت کے اتحاد کو جو خطرہ لاحق ہے وہ ختم نہیں ہوا ہے۔اپنی متاثر کن ترقی اور نا قابل تردید کامیابیوں کے باوجود بھارت کے اتحاد کو جو خطرہ لاحق ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ایک اندرونی تحلیل کا عمل جاری ہے۔ہوسکتا ہے کہ یہ تحلیلی عمل کامیاب رہے یا ناکام رہے۔نتیجہ کا انحصار کئی عوامل پر ہے جس میں پاکستان کا مستقبل کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا ہے۔اس کا انحصار بھارت کے عوام اور لیڈروں پر ہے۔اس کا انحصار خطہ میں ہونے والے واقعات پر ہے اور بڑی طاقتوں کے رویہ پر ہے۔انتشار کا رجحان موجود ہے۔کچھ علاقوں میں ان رجحانات نے شدت اختیار کر لی ہے۔آیا بھارت کا اتحاد برقرار رہتا ہے۔یا ذیلی نیشنلزم کو بالآخر غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب فی الحال ممکن نہیں ہے۔اس معاملہ میں بہت سے عناصر ملوث ہیں۔ بھارت کا موزیک انتہائی پراسرار ہے۔اسکے بہت سے دیوتا ایک ہی مندر کی چھت تلے یا کھلے آسمان کے نیچے رہ سکتے ہیں اگر مندر بہت چھوٹا ہوتو پھر ان میں ٹکراؤ بھی ہوسکتا ہے اور بھارت کو ایسے کشت وخون میں جھونک سکتا ہے جس میں بھائی بھائی کا گلہ کاٹے۔جواہرلال نہرو ہمیشہ اسی بات سے خوفزدہ رہتے تھے۔انہیں خوف تھا کہ یہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک وطیرہ رہا ہے۔اس نمونہ یا وطیرہ کو تبدیل کرنے کیلئے بھارتی قیادت کے پاس جدید ذرائع اور وسائل موجود ہیں۔لیکن ایک ایسا نمونہ جس کی گہری جڑیں اشوک کے زمانہ تک پھیلی ہوئی ہوں اس میں جدید ذرائع اور وسائل کو چیلنج کرنے کی قوتِ مزاحمت بھی ہوتی ہے۔کیا پاکستان نسلوں اور قوموں کے اس انقلابی عمل میں ایک محرک ثابت ہوگا؟

یہ پاکستان کے بارے میں خط نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں ایک چھوٹی سی کتاب لکھ دیتا جس کا عنوان ''گلمپسیز آف پاکستان ہسٹری'' (پاکستان کی تاریخ کے مناظر) ہوتا۔ وقت اس کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ قوم بدترین قسم کے بحران میں مبتلا ہوگئی ہے۔ وہ بقاء اور شکست و ریخت کے درمیان سڑک کے بیچ میں کھڑی ہوئی ہے۔ پاکستان کی تخلیق کے بعد سے ہی بحران کے بعد بحران بڑی تیزی سے آتا رہا ہے۔ اس ملک کی تخلیق کی خاطر لاکھوں جانوں کو قربان ہونا پڑا تھا۔ پاکستان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ محمد اقبالؒ کا خواب اور قائداعظم محمد علی جناح کی تخلیق ہے۔ کیا خواب میں کوئی غلطی ہوئی تھی، اس بارے میں مختلف آراء کا اظہار کیا گیا ہے اور کیا جاتا رہے گا۔ اگلے چند سال میں یہ مسئلہ غالبًا طے ہو جائے گا اور شاید ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ایسا ہو جائے لیکن ایسا بغیر کشت وخون کے نہیں ہوگا۔ یہ عمل ناگزیر نہیں ہے۔ لیکن حکمران فوجی جنتا کی موجودہ پالیسیاں اس ملک کو اس افسوسناک صورت حال کی جانب دھکیل رہی ہیں جو ناگزیر ہوتی جارہی ہے۔ ۹ جون ۱۹۷۸ءکو عوامی جمہوریہ چین کے نائب وزیراعظم ٹینگ سیاؤ پنگ نے کہا ہے کہ نسلِ انسانی تیسری عالمی جنگ کی دہلیز پر کھڑی ہے۔ اگر عالمگیر جنگ کی خوفناک تباہی ہوتی ہے تو پاکستان کے مستقبل کا تعین باقی دنیا کے مستقبل کے تعین سے ہوگا۔

ایک وقت تھا کہ قائداعظم کو ہندومسلم اتحاد کا سفیر کہا جاتا تھا۔ بعد میں جب انہیں ہندو نیشنلزم کی تنگ نظر ذہنیت کا یقین ہوگیا جو سیاست اور اقتصادیات پر ہندو غلبہ پر مبنی تھی تو انہوں نے اقبالؒ کے خواب کی تکمیل کی جانب توجہ مبذول کی اور ایسا غیر معمولی عزم کے ساتھ کیا۔ پاکستان کی تخلیق کی مزاحمت ایک ایسی پہاڑ کی چوٹی کی مانند تھی جو ناقابلِ رسائی ہو۔ یہ مزاحمت انڈین کانگریس کی طرف سے اور نیشنلسٹ

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

مسلمانوں کی طرف سے کی گئی جن میں مودودی اور انکی جماعت اسلامی شامل تھی۔ گاندھی نے اعلان کیا کہ وہ بھارت ماتا کی تقسیم کیلئے کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ مسلم اکثریت والے صوبوں میں پاکستان کی مزاحمت سر خضر حیات خان ٹوانہ کی طرف سے ہوئی جو پنجاب کے وزیراعلیٰ اور صوبہ میں مخصوص مفادات والے طبقات کے لیڈر تھے۔ بنگال میں یہ مزاحمت شیر بنگال فضل الحق کی پارہ صفت سیاست کے ذریعہ ہوئی۔(مشکل یہ ہے کہ ہماری سیاست میں بہت سے شیر پیدا ہوتے ہیں لیکن جب آزمائش کا وقت آتا ہے تو وہ بلیاں بن جاتے ہیں)۔

سندھ میں پاکستان کی مزاحمت اللہ بخش کی طرف سے ہوئی لیکن وہ ۱۹۴۳ء میں قتل کردیئے گئے اور جی ایم سید نے ان کا چوغہ پہن لیا یعنی ان کی پیروی شروع کر دی۔صوبہ سرحد میں مزاحمت کی قیادت سرحدی گاندھی عبدالغفار خان نے کی اور یہاں تک تخلیق پاکستان کی مخالفت کی کہ صوبہ سرحد کی مستقبل میں وابستگی کیلئے ریفرنڈم منعقد کرانا پڑا۔ بلوچستان کے زیادہ تر بااثر سردار پاکستان کے حق میں نہیں تھے۔اس معاملے کو طے کرنے کیلئے جو شاہی جرگہ منعقد ہوا تھا اس کو صورت حال سے آگاہ کرنے کیلئے بہت کچھ کام کرنا پڑا تھا۔ریاست جموں وکشمیر میں شیخ محمد عبداللہ دوقومی نظریہ کے خلاف تھے۔

پھر پاکستان کس طرح عالم وجود میں آیا۔مسلم عوام نے قائداعظم کا ساتھ دیا۔ انہوں نے اپنے روایتی قسم کے لیڈروں کو مسترد کر دیا اور پاکستان اپنے خون میں رنگے ہوئے ہاتھوں کے ذریعہ حاصل کیا۔ انڈین کانگریس کی معاندانہ پالیسیوں نے اور انگریزوں کے منفی رویہ نے انہیں تخلیق پاکستان کے لئے مزید اکسایا۔ یہ مسلم عوام کے عزم وجذبہ کی فتح تھی جن کی قیادت ایک جرأت منداور بے

Copyright © www.bhutto.org

باک لیڈر کر رہا تھا۔

قرار داد پاکستان جو مسلم لیگ نے قائداعظم کی زیر صدارت لاہور میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منظور کی تھی اس کی دو خصوصیات تھیں۔

(الف) اس نے برصغیر کے شمال مغرب اور شمال مشرق کے مسلم اکثریت والے صوبوں اور علاقوں پر مشتمل مسلمانوں کے ایک وطن کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔

(ب) اس نے پاکستان کے صوبوں اور ریاستوں کو صوبائی خودمختاری دینے کا وعدہ کیا تھا۔

اس جذباتی تموج کے زمانہ میں آئینی مسائل پر اور پاکستان کی سرحدوں کے بارے میں بہت کم توجہ مبذول کی گئی۔ ہر خواب دیکھنے والے نے اپنے خواب کی شاندار تعبیر پیش کی۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد جب تحریک پاکستان پر سورج غروب ہو چکا تھا اور طبل جنگ کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی تو صوبائی خودمختاری کے سوال نے اپنا سر اٹھایا۔ بعد کے برسوں میں یہ ایک مرکزی مسئلہ بنا رہا۔

پاکستان کی سیاست کے الجھے ہوئے تانے بانے میں صوبائی خودمختاری کا مسئلہ شروع سے ہی ایک بنیادی مسئلہ بنا رہا ہے۔ آئین سازی کی پہلی کوشش جو بیسک پرنسپلز کمیٹی رپورٹ (بنیادی اصولوں کی کمیٹی رپورٹ) کے نام سے مشہور ہے اسی مسئلہ پر ناکامی کا شکار ہو گئی۔ میرا ارادہ اس موجودہ بحران کی شدت و اہمیت کو اجاگر کرنے کیلئے ان سیاسی غلطیوں کو گنانے کا نہیں ہے جو قیام پاکستان کے بعد سے کی جاتی رہی ہیں۔ اندرونی طور پر یہ بحران بہت سنگین ہے۔ میں صوبائی خودمختاری کے

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

مسئلہ پر اس لئے بحث کر رہا ہوں کہ یہ ایک محوری یا مرکزی مسئلہ ہے۔ بعد میں یہ بحران پیریٹی (مساوات) کے فارمولہ سے پیچیدہ بنا دیا گیا جس کو مشرقی پاکستان کو اس کے جائز حقوق سے محروم کرنے کیلئے عوام دشمنوں نے وضع کیا۔ جس وقت صوبائی خودمختاری کے مسئلہ پر سمجھوتہ ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا گورنر جنرل غلام محمد نے آئین ساز اسمبلی کو غیر قانونی طور پر برطرف کر دیا۔ اس نے یہ خیال کیا کہ اس کے گروہ یا گروپ کے خصوصی مفادات کو آئینی سمجھوتہ سے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ ۱۹۵۵ء میں مغربی پاکستان میں ایک یونٹ (صوبہ) قائم کر دیا گیا۔ جس سے مغربی پاکستان کے صوبوں کی جیسی کچھ بھی خودمختاری تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ ایک یونٹ اور مساوات کے جڑواں ستونوں پر ۱۹۵۶ء کا آئین دوسری آئین ساز اسمبلی نے تعمیر کیا جو پہلی آئین ساز اسمبلی کی طرح حقیقی معنیٰ میں عوام کی نمائندہ نہیں تھی۔

ایک یونٹ اور مساوات کے اطلاق کا مطلب دو ریاستیں تھا جس میں ایک ریاست کو دوسری ریاست پر غلبہ حاصل تھا۔ دونوں مغربی اور مشرقی پاکستان پر غلبہ کا آلہ کار وہی رجعت پسند جتھا یا گروہ تھا۔ ۱۹۵۸ء میں جبکہ عام انتخابات میں صرف پانچ مہینے باقی رہ گئے تھے ۱۹۵۶ء کے آئین کو جنرل ایوب خان کے پہلے مارشل لاء نے منسوخ کر دیا۔ مارشل لاء کے تحت خودمختاری کے مسئلے کو نظر انداز کر دیا گیا۔ ایسا تین سال یا اس سے بھی زیادہ مدت تک ہوتا رہا۔ ۱۹۶۲ء میں ایوب خان نے بنیادی جمہوریتوں کے نظام کی بنیاد پر اپنا آئین دیا جو بالواسطہ انتخابی کالج پر مبنی تھا اور مغربی اور مشرقی پاکستان کے صوبوں کیلئے سیاسی خودمختاری کے بجائے انتظامی نوعیت کا تھا۔ سیاسی خودمختاری کا کوئی متبادل نہ ہونے کے باعث خودمختاری کا مسئلہ اور زیادہ شدید ہو گیا۔ وہی رجعت پسند جتھا یا گروہ حکومت کرتا رہا۔ ۱۹۶۹ء میں عوام کی

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

زبردست شورش نے ایوب خان کو اقتدار سے محروم کر دیا۔ بجائے اس کے کہ وہ اقتدار قومی اسمبلی کے اسپیکر کو منتقل کرتے جیسا کہ خود ان کے ۱۹۶۲ء کے آئین میں درج تھا ایوب خان نے اپنے فوجی آوردہ یحییٰ خاں کو دوبارہ مارشل لاء نافذ کرنے کیلئے کہا اور اس طرح ملک پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ عوام کے مزاج کو دیکھتے ہوئے جنرل یحییٰ خاں نے بالغ رائے دہی اور ایک فرد ایک ووٹ کی بنیاد پر انتخابات کرانے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے ایک یونٹ توڑ کر صوبائی خودمختاری بھی بحال کر دی۔ اپنے لیگل فریم ورک آرڈر (قانونی ڈھانچہ کا نظام) کے ذریعہ یحییٰ خاں نے حالات کو اس طریقہ سے ڈھالنے کی کوشش کی کہ جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ انہوں نے عوام کے مطالبات کو تسلیم کر لیا ہے لیکن درحقیقت وہ اپنے اور اپنے گروہ کے اختیارات برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ تاہم صورتحال ان کی ریشہ دوانیوں سے کہیں زیادہ آگے نکل چکی تھی۔

برسوں کے ظلم کے بعد جب سیلاب کے دروازے کھلے تو کوئی بھی اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ انہیں ایک انقلاب عظیم کے بجز بند کر سکے۔ مجیب الرحمان نے محسوس کیا کہ بس اب کافی کچھ ہو چکا۔ اس نے اپنے مشہور چھ نکات کے انتخابی منشور پر انتخابی مہم چلائی جس کا مطلب کنفیڈرل نوعیت کی صوبائی خودمختاری تھا۔ اس جنگجویانہ فریاد پر اس نے مشرقی پاکستان میں انتخابات میں عظیم کامیابی حاصل کر لی۔ ہماری پارٹی نے سندھ اور پنجاب میں اکثریت حاصل کی اور وہ مغربی پاکستان میں ایک اکثریت والی پارٹی بن گئی۔ ہم نے مجیب الرحمان کو واضح طور پر بتا دیا کہ ہم نہ صرف خوش ہوں گے بلکہ عزت محسوس کریں گے اگر ہم حزبِ اختلاف کی بینچوں پر بیٹھیں لیکن ایسا ہم صرف وفاقی ڈھانچہ ہی میں کریں گے لیکن اگر ڈھانچہ کنفیڈریشن کا ہوا تو

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

کنفیڈریشن کے دونوں بازوؤں کو حکومت میں شرکت کرنا ہوگی۔ یہ ایک سادہ سی اور ناقابل تنقید تجویز تھی۔ اگر مجیب الرحمان اپنے چھ نکات کے ساتھ اس حد تک سمجھوتہ کرنے کو تیار ہوتا کہ حکومت کا ڈھانچہ وفاقی نوعیت کا ہوتو وہ بڑی خوشی سے وفاقی حکومت کی تشکیل کر سکتا تھا۔ اگر وہ اپنے مؤقف سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہ ہوا اور اس نے کنفیڈریشن بنانے کا تہیہ کر رکھا ہوتو وہ ملک کے دوسرے بازو کی اکثریتی پارٹی کو مسترد کر کے کنفیڈریشن پر حکومت نہیں کر سکتا تھا۔ مجیب الرحمان اپنے چھ نکات سے ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہیں تھا اس نے سب کچھ لے لینے یا بالکل چھوڑ دینے کا رویہ اختیار کیا تھا۔ اس طرح حقیقی تعطل پیدا ہو گیا۔ جنرل یحییٰ خان نے خیال کیا کہ یہ تعطل انہیں عمر بھر برسراقتدار رہنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ انہوں نے اس تعطل کو ختم کرنے کیلئے فوجی کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی فوجی کارروائی نے جس کو کسی معقول سیاسی طریقہ کے مطابق حق بجانب قرار نہیں دیا جا سکتا تھا بھارت کو نومبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں فوجی اقدام کرنے کا بہانہ فراہم کر دیا۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء تک ڈھاکہ بھارتی فوج کے قبضہ میں آ گیا اور مغربی پاکستان کے ۹۰ ہزار جنگی قیدی بھارت کی تحویل میں آ گئے۔

میں اس وقت اقوام متحدہ میں تھا اور ایک ناممکن صورت حال کو بچانے کیلئے از حد کوشش کر رہا تھا۔ جب جنرل یحییٰ خان نے ہونے والی تباہی کا جائزہ لیا اور انہیں شکست ہو جانے کا مکمل یقین ہو گیا اور یہ امکان پیدا ہو گیا کہ کچھ بھی واپس نہیں ہو سکتا اور یہ کہ جو کچھ تھوڑا بہت بچا ہے وہ بھی خطرہ میں ہے تو انہوں نے ایک خصوصی طیارہ مجھے پاکستان واپس لانے کیلئے بھیجا۔ یحییٰ خان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور شراب کی بوتل ان کے پاس رکھی ہوئی تھی جب ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو صبح کے ساڑھے دس

Copyright © www.bhutto.org

بجے انہوں مجھ سے کہا کہ وہ بری طرح ناکام ہو گئے ہیں اور یہ کہ میں شکست خوردہ پاکستان کا چارج سنبھال لوں اس لئے کہ صرف میں ہی باقی ملک کو بچانے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ ان نامبارک حالات میں مَیں نے سوا بارہ بجے دوپہر کو صدر پاکستان کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔

میں نے تمام محاذوں پر بڑی سرگرمی کے ساتھ پیشرفت کی۔ جن اولین کاموں پر میں نے توجہ مبذول کی ان میں آئین سازی کا کام شامل تھا تاکہ آئین صوبائی خودمختاری کے پریشان کن سوال پر جمہوری اتفاق رائے سے منظور ہو جائے۔ میں نے اقتصادیات کو مجتمع کیا۔ میں نے اہم سماجی اور اقتصادی اصلاحات کیں۔ میں نے بنگلہ دیش کے مسئلہ کو اُسے تسلیم کر کے حل کیا۔ میں نے بھارت کے ساتھ شملہ معاہدہ کیا جس میں کوئی خفیہ شق نہیں تھی اور سندھ اور پنجاب کا ۵ ہزار مربع میل سے زائد علاقہ پاکستان کیلئے واپس لیا۔ میں نے ۹۰ ہزار جنگی قیدی عزت کے ساتھ لئے اور ایسا بغیر جنگی مقدمات کے ہوا جن کے چلائے جانے کا خطرہ تھا۔ میں نے لاہور میں اسلامی سربراہ کانفرنس منعقد کی۔ میں نے امریکہ کی جانب سے اسلحہ کی سپلائی پر جو پابندی عائد تھی اسے ختم کرایا۔ میں نے مسلح افواج کو جدید بنایا۔ میں نے ملک کو دوبارہ راستہ پر ڈال دیا۔ ملک کی بحالی حیرت انگیز تھی۔ مجھے سب سے بڑا اطمینان اس بات سے حاصل ہوا کہ میں نے جمہوری طریقوں سے ملک کو کل پارٹی آئین دیا۔ ۱۹۷۳ء کا آئین وہ پہلا آئین تھا جس کو ایک جمہوری اسمبلی نے متفقہ طور پر منظور کیا تھا۔ جو اسلام، جمہوریت اور خودمختاری کی بنیاد پر ایک بنیادی ڈھانچہ فراہم کرتا ہے۔ یہ پاکستان کے چاروں صوبوں کے باشندوں کی آواز تھی جس کا اظہار ان کے منتخب لیڈروں نے ایک آئینی دستاویز میں کیا تھا۔ خودمختاری کا مسئلہ جو ایک نسل

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

کے دور سے زیادہ عرصہ تک حل نہیں ہوا تھا اور جو برصغیر کی سیاست کیلئے زمانہ قدیم سے ایک لعنت سمجھا جاتا تھا آخر کار طے ہو گیا تھا اور عوام اور ان کے منتخب نمائندے مطمئن ہو گئے تھے۔ میں نے ایسی خوشی اور مسرت کی لہر محسوس کی جس سے آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

بلند توقعات اور نئے پیدا شدہ اعتماد کے ساتھ ہم نے ۱۹۷۳ء کے آئین کے نظام اور تحفظ کے تحت کام کرنا شروع کیا۔ صوبائی خودمختاری کی جمہوری طریقہ سے وضاحت کی گئی تھی۔ اس نے چاروں صوبوں میں کام شروع کر دیا۔ یہ ایک حیرت انگیز یا معرکتہ الآراء کارنامہ تھا۔ ہماری پارٹی کو پنجاب اور سندھ کے صوبوں میں قطعی اکثریت حاصل تھی اور اس نے ان دونوں صوبوں میں صوبائی حکومتیں تشکیل دی تھیں۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نہ تو نیپ کو اور نہ ہی اس کی ساتھی چھوٹی جماعت یعنی مفتی محمود کی جمعیت علماء اسلام کو قطعی اکثریت حاصل تھی۔ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو نیپ نے بلوچستان اسمبلی کے عورتوں کے بالواسطہ انتخاب میں صرف ایک ووٹ کی اکثریت حاصل کی تھی۔ یہ اکثریت اس قدر کم یا برائے نام تھی کہ وہ کوئی مستحکم حکومت نہیں بنا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ بلوچستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ صوبائی اسمبلی کی تشکیل ہوئی تھی۔

دوسری باتوں کے علاوہ اس سبب سے کافی ہیرا پھیری ہو رہی تھی۔ دونوں اسمبلیوں میں کچھ بااثر آزاد ممبر تھے لیکن صوبہ سرحد میں ان کی تعداد زیادہ تھی۔ آزاد ممبروں کے ساتھ بات کرنے کیلئے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں ان کو ناقابل اصلاح موقع پرست خیال کرتا ہوں اور وہ غیر ملکی حکومت کا ورثہ ہیں۔ بہرحال ان دونوں اسمبلیوں کے آزاد ممبران، وفاقی حکومت کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے کی

کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے پیپلز پارٹی میں شامل ہونے یا اس کے ساتھ تعاون کرنے کیلئے بہت سی دل کو لبھانے والی تجاویز بھیجیں۔ اس قسم کی تجاویز صوبہ سرحد کے آزاد ممبروں کی جانب سے زیادہ تواتر کے ساتھ آ رہی تھیں۔ شروع میں اور کچھ عرصہ کیلئے میں نے حقارت کے ساتھ ان کی تجاویز کو مسترد کر دیا تھا۔ میں نے پارٹی کی مرکزی کمیٹی سے کہہ دیا تھا کہ آزاد ارکان اسمبلی پھیل جانے والے افراد ہیں۔ وہ چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والے ہیں۔

میں نے مرکزی کمیٹی سے کہا تھا کہ نیپ اور جے یو آئی نے بالآخر ایک متفقہ آئین بنانے میں تعاون کیا ہے اور اگر تعاون نہیں بھی کیا ہے تو کم از کم انہوں نے اس سے اتفاق رائے کیا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے مرکزی کمیٹی کے ارکان سے کہا کہ مجھے بہت اہم داخلی اور خارجی معاملات طے کرنے ہیں اس لئے میں اپنی توانائیوں کو صوبہ سرحد اور بلوچستان میں آزاد ممبروں کی پارہ صفت حمایت کی بنیاد پر غیر مستحکم حکومتیں برقرار نہیں رکھ سکتا۔ میں نے مرکزی کمیٹی سے کہا کہ دوسری وجوہات کے علاوہ ان وجوہات کی بنیاد پر میں نیپ اور جے یو آئی کی مدد کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں کہ وہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں حکومتیں بنائیں۔ میں نے مرکزی کمیٹی کے سامنے وضاحت کی کہ ایسا کرنے سے میرے مسائل میں کمی ہو جائے گی اور نیپ اور جے یو آئی والے بجائے ایجی ٹیشن والی سیاست کے تعمیری نوعیت کی سیاست میں لگ جائیں گے میں نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نیپ کے گورنر مقرر کرنے کا انوکھا اور غیر متوقع قدم اٹھایا تا کہ دونوں صوبوں میں نیپ اور جے یو آئی کے درمیان جوڑ انواں ڈول قسم کا اتحاد ہے اس کو استحکام حاصل ہو جائے اور آزاد ممبروں کی پارلیمانی ریشہ دوانیوں کا توڑ ہو سکے۔

نیپ کے حق میں اس قدر خیر سگالی کا جذبہ دکھانے کی کچھ دوسری وجوہات بھی تھیں۔ میری پارٹی اور دوسری پارٹیوں میں بہت سے سیاست دان خصوصاً قیوم خان کی مسلم لیگ کے سیاستدان اس خیر سگالی کے جذبہ کے اظہار پر بڑے چوکنا اور حیرت زدہ ہو گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اب خاتمہ ہوا چاہتا ہے۔ نہ صرف سیاستدان بلکہ ہمارے معاشرے کے بہت سے طاقتور اور بااثر طبقات پریشان ہو گئے تھے۔ نیپ کا پاکستان کی مخالفت میں ایک طویل اور انمٹ ریکارڈ تھا۔ تخلیق پاکستان کے بعد نیپ کے لیڈر بہت برسوں تک یکے بعد دیگرے حکومتوں کے ہاتھوں جیلوں میں رہے تھے۔ جنرل یحییٰ خان جنہوں نے اپنے مارشل لاء کا آغاز نیپ کے ساتھ دوستی کا اظہار کر کے کیا تھا اپنے زوال سے چند ماہ پیشتر ہی اسے غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔ اب صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نیپ کے گورنر مقرر کر کے ایک غیر معمولی اقدام کر رہا تھا اور جے یو آئی کی شرکت میں حکومتیں بنانے میں ان کی مدد کر رہا تھا۔ نیپ کے بارے میں کچھ وائٹ پیپر (قرطاس ابیض) دستاویزات اور سپریم کورٹ کا فیصلہ موجود ہے جن میں اس دور کے واقعات کا ذکر ہے۔ اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ملک کے دولخت ہو جانے کے بعد میں نے نیپ کے آگے تعاون کا ہاتھ بڑھانے کی انتہائی سنجیدہ اور مخلصانہ کوششیں کیں۔ یہ پالیسی کا نہ کہ موقع یا محل کی سہولت والا معاملہ تھا۔ میرا ایسا کرنے کی وجوہات تھیں۔ یہ وجوہات ذاتی نوعیت کی یا مطلب پرستی پر مبنی نہیں تھیں۔ کوئی بھی وجہ کسی طرف داری کے سبب سے نہیں تھی۔ میری وجوہات کا اصل سبب پاکستان اور سارے خطہ کا مفاد تھا۔ میری وجوہات بلند خیال پر مبنی تھیں، نہ کہ نچلی سطح سے تعلق رکھتی تھیں۔ میں پاکستان کو ایک اور موقع فراہم کرنا چاہتا تھا۔ میں صاف دل کے ساتھ ابتدا کرنا چاہتا تھا۔

یہ کہنا بالکل فضول بات ہے اور یہ دلیل دینا انتہائی لغو اور بیہودہ ہے کہ میں نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں پی پی پی کی حکومتیں قائم کرنے کیلئے نیپ، جے یو آئی کی حکومتوں کو ختم کرنے کی سازش کی۔ اگر میرا یہ مقصد ہوتا تو میں ان دونوں صوبوں میں نیپ۔ جے یو آئی کی حکومتیں بنانے میں اس قدر غیر معمولی طور پر کیوں مدد کرتا۔ مجھے آبادی کے ایک طبقہ کی طرف سے اس تنقید کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جو مجھے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نیپ کی حکومتیں قائم کرا کر برداشت کرنی پڑی۔ میں دونوں اسمبلیوں کے آزاد ممبروں کو جھڑکی نہیں دیتا جو وفاقی حکومت کی حمایت و سرپرستی حاصل کرنے کے خواہشمند تھے۔ مرکز میں تو پی پی پی کی حکومت تھی۔ سندھ اور پنجاب میں بھی پی پی پی کی حکومتیں تھیں۔ مجھے نئے آئین کے تحت جمہوریت کے منظم طور پر ارتقاء میں اور دیرپا استحکام کے حصول میں زیادہ دلچسپی تھی بمقابلہ اس امر کے کہ میں دو صوبائی حکومتوں کو گرا کر نا قابل اعتماد آزاد امیدواروں اور کچھ پی پی پی کے ممبروں پر مشتمل حکومتیں بناؤں۔ ایسا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اعلیٰ تر مقاصد زیادہ اہم تھے۔ اس سطح پر کامیابی کا مطلب ہر طرف کامیابی تھا۔ میں اس قدر احمق نہیں تھا کہ میں اپنے عظیم مشن کو خطرہ میں ڈالتا اور صوبہ سرحد اور بلوچستان میں پی پی پی کی حکومتوں کو قائم کرنے کے مشکوک اور غیر دلکش مقصد کی خاطر ہر شے کو خدا حافظ کہہ دیتا۔

محاذ آرائی سے بچنے کیلئے میری کوششیں جامع قسم کی تھیں۔ میں سانڈ سے لڑنے والے پہلوان کی مانند تھا۔ بہت سے مفاد پرست عناصر چاہتے تھے کہ میں سانڈ کے پیٹ میں تلوار گھونپ دوں لیکن میں ہر ہڑ بڑی یا بھاگڑ میں ایک طرف کو ہو جاتا تھا یا طرح دے جاتا تھا۔ یہاں تک کہ میرے ایک دوست نے جن کا اس محاذ آرائی میں

 Copyright © www.bhutto.org

کوئی بے جا مقصد نہیں تھا۔ مجھ سے دریافت کیا تھا کہ کیا مجھ میں لڑنے کا حوصلہ اور چیلنج قبول کرنے کا جذبہ باقی نہیں رہا ہے۔ میں نے اپنے دوست کو وضاحت کرتے ہوئے محاذ آرائی کے وسیع معنی بتائے تھے اور انہیں یقین دلایا تھا کہ اگر قومی اتحاد کی خاطر یہ بات ناگزیر ہوگئی تو میں نہ صرف ثابت قدم رہوں گا بلکہ سرخرو ہو کر نکلوں گا جو قومی اتحاد کیلئے مفید ہوگا۔ میں نے حساب لگالیا تھا اور میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ہر مسئلہ کے حل سے پہلے ایک سمجھوتہ یا مفاہمت کو برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔ جے یو آئی کوئی بڑا عنصر نہیں تھی۔ پارٹی کے لیڈر مفتی محمود ایک معمولی ذہانت والے آدمی تھے جو صرف ہمارے پسماندہ معاشرہ میں ہی وزیراعلیٰ ہو سکتے تھے۔ نیپ ایک دوسری نوعیت کی جماعت تھی لیکن اس کی عوامی بنیاد کچھ جنگجو قسم کے لوگوں کی حمایت تک محدود تھی۔ صوبہ سرحد کے جنوبی اضلاع میں نیپ کو کوئی قابل ذکر حمایت حاصل نہیں تھی۔ اس کے مضبوط گڑھ ضلع پشاور کے کچھ حصوں میں اور مردان اور صوابی میں تھے۔ اس نے مالاکنڈ میں بھی کچھ پیشرفت کی تھی۔ بلوچستان میں چونکہ قبائلی نظام تھا اس لئے نیپ بلوچستان کے صرف ان علاقوں میں طاقتور تھی جہاں قبائلی سرداروں کا تعلق نیپ سے تھا۔ ایسا خاص طور پر مری، بگٹی کے علاقہ میں اور جھلوان کے منگل علاقہ میں تھا۔ سیروان کے کچھ علاقوں میں بھی نیپ کے خاصے حامی تھے۔ لسبیلہ، سبی، کچھی اور پختون علاقوں میں اس کا اثر ورسوخ برائے نام تھا۔ کوئٹہ میں بھی نیپ کا کچھ اثر ورسوخ تھا لیکن آبادکاروں کی خاصی آبادی کی وجہ سے یہ اثر ورسوخ زائل ہوگیا تھا۔ ان آبادکاروں میں ہزارہ کے لوگ اور مختلف طبقات کے لوگ شامل تھے۔ پارلیمانی جمہوریت کی ریاضی میں نیپ کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں تھی۔

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

لیکن مسئلہ زیادہ وسیع جہت کا تھا۔ نیپ کے لیڈر خصوصاً بلوچوں میں مخلص اور ذہین تھے۔ میری ایماندارانہ اور غیر جانبدارانہ رائے میں نیپ کے صدر جو ایک سر برآوردہ پختون ہیں ایک ایسے سیاستدان ہیں جن کی استحقاق یا اصلیت سے بڑھ کر قدر و منزلت کی جاتی ہے۔ وہ بلاشبہ ذہین ہیں لیکن وہ مایوس کن حد تک صرف ذاتی تصورات تک محدود ہیں۔ یا تو اپنے ذاتی تصورات کی وجہ سے یا پھر اپنی مزاجی کیفیت کے باعث ان میں یکا یک ایک زاویہ نگاہ اپنا لینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اور وہ نقصان دہ غلطیاں کرتے ہیں اور مہلک قسم کے غلط اندازے قائم کرتے ہیں۔ وہ فرد مایہ اور کم ظرف بھی ہو سکتے ہیں۔ اکبر بگٹی کے علاوہ دوسرے بلوچ لیڈر اس قدر چمک دمک والے تو نہیں ہیں لیکن زیادہ پختہ کار ہیں۔ عوامی مقبولیت اور قیادت کی صلاحیت سے زیادہ نیپ کی اہمیت اس کے مؤقف یا عزم و یقین میں ہے۔ اس کے مؤقف ہی کی مقناطیسی اپیل نے ذیلی نیشنلسٹ عناصر کو خصوصاً نوجوانوں کو اپنی طرف مائل کیا ہے۔ اس کے اسی مؤقف کے باعث بالآخر میری اس سے محاذ آرائی ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک طویل اور ناخوشگوار جدوجہد ہوگی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس محاذ آرائی کا سنگین ردعمل قومی اتحاد پر ہماری سیاست میں جمہوریت کی حیثیت پر ہوگا۔ ان اسباب کی بناء پر میں کوشش کر رہا تھا کہ نیپ کو ''تاریخی سمجھوتہ'' کرنے کی ترغیب دوں۔ میں وہی بات کر رہا تھا جو ایلڈ و مورو اٹلی میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ نیپ پاکستان کے اتحاد کے حلقہ میں شامل ہو جائے۔

لیکن جیسا کہ میں نے اپنا حساب کتاب لگایا تھا۔ نیپ کے لیڈروں نے بھی اپنے اندازے قائم کئے تھے۔ وہ پاکستان کے ایز یکو بیلنگرز ہونے کیلئے تیار نہیں تھے۔ ڈھاکہ کے زوال اور افغانستان میں سردار محمد داؤد کے برسر اقتدار آنے کے

بعد نیپ کے لیڈر اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اب ان کے اقدام کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ واقعات تیزی سے رونما ہو رہے تھے۔ ان کے چیلنج کرنے کے رویہ کے باعث بلوچستان کی صوبائی حکومت کو برطرف کرنے کیلئے مجبور ہو گیا۔ آئین کے تحت میں نے صوبہ بلوچستان میں صدارتی راج نافذ کر دیا اور اکبر بگٹی کو بلوچستان کا گورنر مقرر کر دیا۔ اکبر بگٹی میری پارٹی کے رکن نہیں تھے انہوں نے میری پارٹی میں شمولیت اختیار نہیں کی۔ اس وقت وہ ایک ایسی پارٹی میں شامل ہیں جس کی شناخت ہی مشکل ہے۔ حالانکہ میرا اقدام بلوچستان تک محدود تھا لیکن صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ مفتی محمود نے نیپ سے ہمدردی کی بنیاد پر استعفیٰ دے دیا۔ انہوں نے ایسا غالباً برطرف کئے جانے کے خوف سے نہ کہ ہمدردی کی بناء پر کیا۔ اس کے بعد گہرے اور خوفناک بادل آئے۔ بلوچستان میں بغاوت کو کچلنا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف تھا۔ اس بغاوت کو کچلنے میں تین سال سے زائد عرصہ لگا۔ فوج کو بغاوت کچلنے کیلئے ملوث کرنا ناگزیر ہو گیا۔ فوجی رول میں توسیع ہوتی رہی۔ اس کے تانے بانے سویلین تقریبات تک پھیل گئے۔

تاہم اگر فوجی کارروائی کے ساتھ ساتھ اس بحران میں، مَیں زبردست سیاسی اور سماجی و اقتصادی حل کا استعمال نہ کرتا تو فوجی آپریشن کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ زرعی شعبہ میں میری بنیادی اصلاحات۔ سرداری نظام کا خاتمہ، سڑکوں کی تعمیر، دیہاتوں میں بجلی پہنچانے کے کام، ٹیوب ویلوں کیلئے کھدائی، ٹریکٹروں کی آوازوں اور دوسرے بہت سے فوائد نے بلوچستان کے غریب لوگوں کی سوچ میں تبدیلی پیدا کر دی۔ میں مبالغہ سے کام نہیں لے رہا ہوں اور نہ ہی خودستائی کر رہا ہوں، جب میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میں نے خوابیدہ بلوچستان کو ہاتھ سے پکڑا اور اسے بیسویں

Copyright © www.bhutto.org

صدی میں چلنے کے قابل بنایا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ باقی پاکستان کی حالت اس صدی میں ہے۔

دو مواقع پر میں نے اندازہ لگایا تھا کہ فوج کو بلوچستان سے واپس بلانے کا وقت آ گیا ہے۔ دونوں ہی مواقع پر فوج کے موجودہ سربراہ نے مجھ سے اپیل کی تھی کہ میں انہیں ڈھیلے سروں کو باندھنے کیلئے آخری توسیع کی اجازت دوں۔ فوجی اقدام کو نمٹانے کے بجائے وہ اور زیادہ اختیارات فوجی اقدام کو نمٹانے کے نام پر طلب کر رہے تھے۔ جب جنرل ٹکا خان فوج کے سربراہ تھے تو ایسا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ فوج کے موجودہ سربراہ کے برعکس وہ سیاسی یا انتظامی نوعیت کی سفارشات نہیں کرتے تھے۔ جنرل ٹکا خان اپنی ذمہ داریوں کو فوجی رول تک ہی محدود رکھتے تھے اور وہ غیر فوجی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتے تھے لیکن یہ شخص حیدرآباد کے مقدمہ میں لوگوں کو پھانسنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ اجازت طلب کرتا رہتا تھا کہ اسے افغانستان میں باغیوں کا پیچھا کرنے کی اجازت دی جائے۔ وہ سول ملازمین پر سخت تنقید کرتا تھا۔ خصوصاً بلوچستان کے آخری چیف سیکرٹری پر۔ چونکہ میں نے مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے ایک مہینہ بعد فوج کو بلوچستان سے واپس بلانے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا اس لئے یہ صورت حال مجھے اس کی عجیب وغریب باتیں برداشت کرنے کیلئے مجبور کرتی تھی۔

صوبہ سرحد میں تشدد ہوا اور گڑ بڑ ہوئی لیکن کہیں بھی اس پیمانہ پر ایسا نہیں ہوا جیسا کہ بلوچستان میں ہوا تھا۔ اس صوبہ میں بموں کے دھماکے کئے گئے اور تخریب کاری کے طریقے اختیار کئے گئے۔ اسکول اور بینک اس تخریب کاری کی کارروائیوں کا نشانہ بنائے گئے۔ بدقسمتی سے نوجوان شیر پاؤ پشاور یونیورسٹی میں ایک بم کے

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

دھماکہ میں ہلاک ہو گئے۔ تاہم مناسب مدت کے اندر صوبہ سرحد کی صورت حال قابو میں آ گئی۔

افغانستان کے صدر محمد داؤد ان واقعات پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں نے بلوچستان اور صوبہ سرحد میں صورت حال کو مؤثر طور پر کنٹرول کرلیا ہے۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ میں نے بحران پر قابو پالیا ہے تو ایک حقیقت پسند شخص کی طرح انہوں نے مجھے کابل مدعو کیا تا کہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان سیاسی اختلافات کو طے کیا جا سکے۔ وہ دوسرے متبادل طریقے آزما چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں نے نہ صرف داخلی بحران پر قابو حاصل کرلیا ہے بلکہ غیر ملکی مداخلت کو بھی غیر مؤثر بنا دیا ہے۔ جس میں امکانی امداد اور اصل امداد دونوں ہی شامل تھیں۔ پانسہ پھینکا جا چکا تھا۔ میں نے خلوص دل سے بات چیت کیلئے ان کی دعوت پر لبیک کہا۔ جب جون ۱۹۷۶ء کے پہلے ہفتہ میں مَیں نے افغانستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو صدر افغانستان نے میرا خوش دلی اور مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے تین سال پہلے اپنی پہلی ہی تقریب میں پاکستان کو دھمکیاں دی تھیں جب وہ ایک فوجی انقلاب کے ذریعے برسر اقتدار آیا تھا۔ کابل میں بات چیت دوستانہ ماحول میں ہوئی۔ صدر داؤد چاہتے تھے کہ میں نیپ کے لیڈروں کو خیر سگالی کا جذبہ پیدا کرنے کیلئے رہا کر دوں۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ جب خیر سگالی کا خوشگوار اثر ہوگا تو افغانستان متنازعہ ڈورنڈ لائن کو تسلیم کر لے گا۔ ان وجوہات کی بنیاد پر جن کے تذکرہ کی اس خط میں ضرورت نہیں ہے، میں نے افغانستان کے صدر سے کہا کہ دونوں خیر سگالی کے جذبات پر ایک ساتھ ایک معاہدہ کی شکل میں عمل ہوگا۔ میں نے ان سے کہا کہ انصاف کا توازن

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

لینے اور دینے کے معاہدہ میں ہے جو ایک ہی وقت ہو۔ میں نے نیپ کے لیڈروں کو رہا کرنے کا وعدہ کیا اور ان کے خلاف الزامات واپس لینے کو کہا جس کے بدلہ میں انہیں ساتھ ہی ساتھ ڈورنڈ لائن تسلیم کر لینا چاہیئے۔ ہم نے اگست ۱۹۷۶ء میں پاکستان میں مذاکرات جاری رکھنے سے اتفاق رائے کیا۔ میرے کابل سے روانہ ہونے سے قبل ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا۔ اس اعلامیہ میں کہا گیا تھا کہ دونوں ممالک اپنے سیاسی اختلافات کو پرامن بقائے باہمی کے پانچ اصولوں کی بنیاد پر طے کریں گے۔

جب داؤد اگست ۱۹۷۶ء میں پاکستان آئے تو یہ بالآخر طے ہو گیا کہ دونوں جانب سے اکٹھا معاہدہ ہوگا جس پر ایک ساتھ عمل کیا جائے گا۔ حکومت پاکستان نیپ کے لیڈروں کو رہا کر دے گی اور ان کے خلاف غداری کے الزامات واپس لے لے گی اور افغانستان کی حکومت موجودہ سرحد (ڈورنڈ لائن) کو تسلیم کر لے گی۔ افغانستان اور پاکستان کے دفاتر خارجہ کے حکام نے اپنے اپنے وزراء کی قیادت میں ''پیکج فارمولہ'' کی تفصیلات لاہور میں اگست ۱۹۷۶ء میں بذریعہ تحریر طے کیں۔ طرفین نے اس امر سے اتفاق کیا کہ میں اکتوبر/نومبر ۱۹۷۶ء میں کابل کا دورہ کروں گا اور افغانستان کے صدر کے ساتھ باضابطہ معاہدہ، معاہدہ کے مسودہ کی شرائط کے مطابق کروں گا۔ دیر میں جو گڑ بڑ ہوئی خواہ وہ کسی سازش کے تحت ہوئی یا نہیں اس کے باعث میں نومبر ۱۹۷۶ء میں کابل نہیں جا سکا۔ پھر ۶ جنوری ۱۹۷۷ء کو نواب شاہ میں میرے اور پاکستان میں متعین افغان سفیر مسٹر نور احمد اعتمادی کے درمیان یہ طے ہوا کہ مارچ ۱۹۷۷ء کے آخر میں کابل جاؤں گا اور ایسا پاکستان میں انتخابات کے ایک یا دو ہفتے بعد کروں گا۔

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

بلوچستان میں بغاوت کے عروج کے دوران بھی میں آخری سیاسی حل کے بارے میں برابر سوچ رہا تھا۔ میں حیدرآباد جیل میں ایک بلوچ لیڈر سے رابطہ قائم کئے ہوئے تھا اور ایسا ذمہ دار درمیانی لوگوں کے ذریعہ کر رہا تھا۔ ان کے ذریعہ میرے اور بلوچ لیڈر کے درمیان خاصا تبادلہ خیال ہوا تھا۔ جب لاہور میں اگست ۱۹۷۶ء میں معاہدہ کا مسودہ تیار ہوا تو میں ان روابط کو بہت زیادہ اور فوری اہمیت دینے لگا۔ بلوچ لیڈر کیساتھ مذاکرات خاصے تفصیلی نوعیت کے تھے۔ نیپ کے صدر کے ساتھ رابطہ کا سلسلہ شروع ہی ہوا تھا کہ ۱۹۷۷ء کے موسم بہار کی اکھاڑ پچھاڑ نے میری غیر منقسم توجہ کو ایجی ٹیشن کی جانب موڑ دیا۔

لاج تو رکھنی ہی تھی۔ خون بالکل بیکار میں تو نہیں بہا تھا۔ ظاہر تھا کہ موجودہ صورت حال یا حالت کی طرف واپسی غیر حقیقت پسندانہ ہوتی کہ جیسے تین سال کے عرصہ میں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اس قسم کی توقع کا یہ مطلب ہوتا کہ بلوچوں نے جو قربانیاں دیں، وہ کسی سبب کے بغیر دیں۔ سبب یا کاز کیا تھا؟ ایک عظیم تر اور آزاد بلوچستان اور پختونستان؟ اگر یہی کاز تھا تو میری حکومت اور پاکستان کے عوام کیلیئے قابل قبول نہیں تھا۔ ہم نے مجبوراً محاذ آرائی کا راستہ اختیار کیا تھا تاکہ پاکستان کی مزید شکست و ریخت کو روکا جا سکے اور اس مقصد میں ہم کامیاب ہو گئے تھے۔ جیسا کہ اس قسم کا مطالبہ میرے لئے اور پاکستانی عوام کیلیئے بالکل نا قابل قبول تھا اسی طرح یہ بات بھی نا قابل عمل تھی کہ فریق مخالف پہلے کی صورت حال پر مراجعت کیلیئے راضی ہو گا۔ نیشنلزم اور ذیلی نیشنلزم کے تقاضوں کو قومی اتحاد کے ساتھ ہم آہنگ کرنا تھا اور ان کے درمیان مصالحت و مفاہمت پیدا کرنی تھی لیکن ایسا ذیلی قومی خواہشات کے معاملہ میں عزت و انصاف کے ساتھ کرنا تھا جن کا اظہار بلوچستان نے ایک

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

بغاوت کی صورت میں کیا تھا۔ سادہ الفاظ میں اس کا یہ مطلب تھا کہ خودمختاری کی حد اور مقدار میں اضافہ کیا جائے۔ اس خودمختاری میں اضافہ کا تعین میرا کام تھا اور اس کیلئے مجھے اسی قسم کی اتفاق رائے حاصل کرنا تھی جیسا کہ میں نے ۱۹۷۳ء میں حاصل کی تھی۔ درمیانی لوگوں کے ذریعہ بلوچ لیڈر کے ساتھ میرے مذاکرات کا یہی مقصد تھا۔ درحقیقت اس نازک موضوع پر صرف ایک درمیانی آدمی کو اعتماد میں لیا گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ سینیٹ کو زیادہ اختیارات دینے کی گنجائش ہے۔ اس امر کی بھی گنجائش ہے کہ وفاقی فہرست میں سے ایک یا دو چیزیں صوبائی فہرست میں منتقل کر دی جائیں۔ ہمیں اس بارے میں اپنے ذہن کھلے رکھنے چاہئیں کہ آیا کانکر ینٹ (جو وفاق اور صوبوں دونوں کیلئے ہو) لسٹ کو برقرار رکھنا چاہئے یا اسے ختم کر دینا چاہئے ۔ خودمختاری کے بارے میں نیا سمجھوتہ جمہوری مذاکرات کے ذریعہ کیا جائے اور یہ مذاکرات ملک کے حقیقی لیڈر کریں۔

مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس مسئلے کو مذاکرات کی میز پر طے کروں گا۔ میری طرف یعنی قومی سطح پر بلوچستان میں بغاوت ناکام ہوگئی تھی اور صوبہ سرحد میں تشدد اور اِکا دُکا گڑبڑ کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ معمول کے مطابق حالات کی بحالی ہو چکی تھی۔ میری خارجہ پالیسی کی وجہ سے اس قسم کی خطرناک غیرملکی مداخلت جیسی کہ افریقہ میں حال ہی میں دیکھی گئی تھی نہیں ہوئی تھی۔ ان مثبت کامیابیوں نے اگست ۱۹۷۶ء میں لاہور میں پاکستان اور افغانستان کے درمیان معاہدہ کے مسودہ کی راہ ہموار کی تھی۔ اب دیرپا سیاسی توازن کیلئے ازسرنو مذاکرات شروع کرنے کیلئے راستہ صاف ہو گیا تھا جو ناراض صوبوں کیلئے قابل قبول ہو اور پاکستان کے متحدہ وفاق کے ڈھانچہ کے اندر ہو۔ مجھے بلوچ اور پختون لیڈروں کی

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

سوچ کا بھی اندازہ لگاتا تھا۔ یہ معلوم کرنا تھا کہ باعزت سمجھوتہ کا ان کا تصور کیا ہے۔ تاہم ڈراؤنا خواب تو ختم ہو چکا تھا۔ درحقیقت اگر حکم چلانے کی پوزیشن میں نہیں تو ہم کم از کم فائدہ کی پوزیشن میں ضرور تھے اور میں یہ بات انتہائی انکساری کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ جب بغاوت عروج پر تھی تو مجھے یہ خوف دامن گیر تھا کہ کہیں پاکستان، بھارت اور افغانستان کے درمیان سروتے میں نہ آ جائے۔ یہ حقیقت کہ ایسا نہ ہوا میری انتہائی اہم کامیابی تھی۔ بغاوت علاقہ میں محدود رہی اور اس پر قابو پا لیا گیا۔ مشرقی پاکستان کے برعکس اس بغاوت نے بین الاقوامی حیثیت اختیار نہیں کی۔ غیر ملکی دروازے بند کر دینے کے بعد اور راستہ صاف کر دینے کے بعد وقت آ گیا تھا کہ بندوقوں کو نیچے رکھ دیا جائے اور مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ یہ مذاکرات مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد شروع نہیں ہو سکے اس لئے کہ موسم بہار میں ایجی ٹیشن شروع ہو گیا۔ جیسے ہی میں نے ایجی ٹیشن کے حل کا بندوبست کیا ملک میں ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔

جولائی ۱۹۷۷ء کے فوجی انقلاب کے بعد جنرل ضیاء الحق نے کابل کا دورہ کیا اور صدر داؤد سے ملاقات کی، کابل سے واپسی کے فوراً بعد انہوں نے نیپ کے لیڈروں کو حیدرآباد جیل سے رہا کر دیا۔ مستقبل قریب میں وقت بتائے گا کہ آیا ایسا غیر مشروط طور پر کیا گیا یا مسئلے کے حل سے قبل مفاہمت یا سمجھوتہ کی یقین دہانی پر کیا گیا۔ مارچ ۱۹۷۸ء میں صدر داؤد نے پاکستان کا دورہ کیا۔ دل خوش کن تقاریر ہوئیں۔ تاہم ایک تقریب میں صدر داؤد نے خاص طور پر کہا کہ سیاسی مسئلے ابھی حل ہونا باقی ہیں۔ کوئی مشترکہ اعلامیہ جاری نہیں کیا گیا، جب سردار داؤد نے پاکستان کا دورہ کیا۔ اگر تیس سال کے تعطل اور ہیجان کے بعد جس میں کبھی کبھی تو بہت زیادہ

 Copyright © www.bhutto.org

اضافہ بھی ہوا، میں جون ۱۹۷۶ء میں کابل میں کابل حکومت سے مشترکہ اعلامیہ جاری کراسکا جو پرامن بقائے باہمی کے پانچ اصولوں پرمبنی سیاسی اختلافات کو طے کرنے کے بارے میں تھا تو پھر یہ ایک معمہ ہے کہ جنرل ضیاء الحق کیوں کابل یا اسلام آباد میں ایک مشترکہ اعلامیہ کے ذریعہ اس کی تصدیق وتوثیق نہیں کرا سکے۔ اگر کوئی زیادہ اہم خفیہ معاہدہ ان کے درمیان ہوا تھا تب بھی جون ۱۹۷۶ء کے کابل اعلامیہ کا اعادہ پاکستان اور افغانستان کے عوام کے فائدہ کیلئے اور زیادہ ضروری تھا۔

شاید ایک نیا خفیہ معاہدہ ہوا تھا جب جنرل ضیاء الحق کابل گئے تھے یا جب سردار داؤد مارچ ۱۹۷۸ء میں پاکستان آئے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اس قدر بڑی کامیابی ہو کہ مشترکہ اعلامیہ کی ضرورت محسوس نہ کی گئی ہو۔ داؤد کے پاکستان کے دورہ کے تقریباً ایک ماہ بعد ۲۷ اپریل ۱۹۷۸ء کو افغانستان میں ایک انقلابی تبدیلی ہوئی۔ افغانستان کے نئے لیڈروں نے اعلان کیا ہے کہ پختون اور بلوچ مسئلہ باقی ہے اور یہ کہ وہ اس سیاسی مسئلہ کا حل پاکستان کے ساتھ پرامن طریقہ سے کرنا چاہتے ہیں۔ گزشتہ دو مہینوں میں یہ بات کئی بار کہی گئی ہے۔ میں تنقید کرنا نہیں چاہتا لیکن ہماری جانب سے افغانستان میں تبدیلی کا ردعمل تباہ کن تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کی حکومت کی چولیں اس تبدیلی کے باعث ہل کر رہ گئی ہیں جیسے کہ اس پر کوئی ناگہانی آفت نازل ہوگئی ہو۔ اذیت دینے کے ساتھ ساتھ اہانت کرنے کی غرض سے حکومت کے پی این اے کے ساتھیوں نے افغانستان کے انقلاب کے بارے میں انتہائی تباہ کن اور غلط تصورات پرمبنی بیانات جاری کئے۔ چونکہ پریس پر سخت ترین کنٹرول تھا اس لئے افغان ان اشتعال انگیز بیانات کے بارے میں یہی سمجھے کہ ان بیانات کا کوئی تعلق حکومت پاکستان سے نہیں ہے۔ ان پر بعد میں اس حقیقت کا

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

انکشاف ہوا۔ بالکل غیرضروری اعلانات کئے گئے کہ پی این اے کے لیڈروں کے ساتھ کانفرنسیں منعقد کی جا رہی ہیں جن میں افغانستان میں تبدیلی کے بارے میں غور وخوض ہوگا۔

اسی عرصہ کے دوران بھارتیوں نے (جنہوں نے افغانستان کی نئی حکومت کوفوراً تسلیم کرلیا تھا) ''بڑے بھائی'' کا کردارادا کرنا شروع کر دیا۔ بھارتی وزیرخارجہ نے اس قسم کے کئی بیانات دیئے کہ بھارت نے پاکستان کو یقین دلایا ہے کہ افغانستان میں تبدیلی کے باعث گھبرانے یا پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ان بیانات کا مقصد نئے افغان لیڈروں کی پسندیدگی کا حصول تھا اوراس امر کی توثیق کرنا تھا کہ پاکستان کوافغانستان میں تبدیلی کے باعث گھبراہٹ اور پریشانی ہے۔ بھارتی وزیرخارجہ کو مداخلت کرنے اور مربیانہ رویہ اختیار کرنے کا کوئی حق نہیں تھا اوراس کے ایسا کرنے کے باعث معاملات بہتر ہونے کے بجائے اوربھی خراب ہو گئے۔ اس نے ایک پتھر سے دو پرندوں کا شکار کیا۔ پاکستان، افغانستان کے بارے میں اس قدر لاعلم نہیں ہے کہ وہ بھارت کی یقین دہانی یا پسندیدگی پر یقین وبھروسے کرے۔ واشنگٹن میں افغان وزیرخارجہ نے خاص طور پر اس امر کا ذکر کیا کہ پاکستان نے ان کی حکومت کوتاخیر سے تسلیم کیا۔ تخفیف اسلحہ کے بارے میں اقوام متحدہ کا خصوصی اجلاس پاکستان اور افغانستان کے درمیان سیاسی تنازعات کو اچھالنے کیلئے کوئی مناسب پلیٹ فارم نہیں تھا۔ یہ خصوصی اجلاس تخفیف اسلحہ کے مسئلہ پر بحث کیلئے بلایا گیا تھا۔

اس کے باوجود پاکستان اورافغانستان کے نمائندوں کے درمیان بیانات کا تبادلہ ہوا اور یہ بیانات پاکستان اورافغانستان کے درمیان سیاسی اختلافات سے

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

متعلق تھے۔ پاکستانی نمائندہ نے اس مشترکہ اعلامیہ کا سہارا لیا جو میں نے جون ۱۹۷۶ء میں افغان حکومت سے حاصل کیا تھا اور جو پاکستان اور افغانستان کے درمیان بات چیت کی بنیاد قرار پایا تھا۔ حالانکہ صدر داؤد اور جنرل ضیاء الحق کی کابل اور اسلام آباد میں بعد میں ملاقاتیں ہوئی تھیں لیکن نیو یارک میں اقوام متحدہ کے خصوصی اجلاس میں پاکستان کے نمائندہ کو میرے جون ۱۹۷۶ء کے اعلامیہ ہی کا سہارا لینا پڑا تھا۔ وہ مزید پیشرفت کو ظاہر کرنے کیلئے نہ کوئی اور دستاویز پیش کر سکا اور نہ ہی کسی اور معاہدہ یا اعلامیہ کا حوالہ دے سکا۔ ان اسباب کی بنا پر جن کا علم صرف اسی کو تھا پاکستانی نمائندہ نے سمجھوتہ کے اس مسودہ کو دبا دیا جو لاہور میں ۱۹۷۶ء میں تیار کیا گیا تھا اور جس میں سیاسی اختلافات کو طے کر دیا گیا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ صدر داؤد اور جنرل ضیاء الحق کی کابل اور اسلام آباد میں ملاقاتوں کے درمیان صدر داؤد نے اگست ۱۹۷۶ء کے سمجھوتہ کی کسی سفارتی عیاری کے ذریعہ شکل بگاڑ دی ہو۔

پاکستان کیلئے یہ کس قدر بدقسمتی کی بات تھی کہ جو مسئلہ برسوں کی انتھک کوششوں کے بعد حل ہو گیا تھا ایک بار پھر متنازعہ بن گیا تھا۔ اب جھولا یا ہنڈولا پاکستان کی طرف چلا گیا تھا۔ پاکستان میں ہر بنیادی مسئلے کو از سرِ نو چھیڑا گیا ہے اور یہ مسئلہ بھی ان از سرِ نو چھیڑے جانے والے مسائل میں شامل ہے۔

پاکستان اپنی جہت اور استحکام کے احساس سے محروم ہو گیا ہے۔ ملک تاریکی کی حکومت کے تحت ہے۔ اس کے برعکس افغانستان سیاسی رجحان رکھنے والی قیادت کے تحت آ گیا ہے۔ نئی حکومت نے پالیسی بیانات دیئے ہیں جن میں عوام کی اعلیٰ ترین حیثیت اور اختیارات کو تسلیم کیا گیا ہے اور ثقافتوں کی مساوات کا ذکر کیا گیا ہے۔ نئے افغان لیڈر اصلی پختون ہیں لیکن ان میں نسلی تعصب نہیں ہے۔ نئی حکومت

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

نے اعلان کیا ہے کہ اس کی خارجہ پالیسی کی بنیاد ناوابستگی ہوگی۔ تاہم ایک پڑوسی بڑی طاقت کے ساتھ اس کا اعتماد کا رشتہ ہے۔ اگر یہ پڑوسی بڑی طاقت ایک ارب ڈالر سے زائد کا فوجی ساز وسامان صومالیہ کو فراہم کرسکتی ہے اور اسے غیر اہم کہہ کر معاف کرسکتی ہے تو وہ اس خطہ میں اور بھی زیادہ جرأت مندانہ اقدام کرسکتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ بڑی طاقت افغانستان کو اربوں ڈالر مالیت کی فوجی امداد فراہم کرسکتی ہے جس میں جدید ترین میزائل، ۲۴ بھی شامل ہیں۔ یہ جدید ترین اسلحہ کابل کے بازاروں میں تو نہیں رکھا جائے گا۔ افغانستان کے وزیر خارجہ نے نیو یارک میں کہا کہ صرف پاکستان کے ساتھ افغانستان کے سیاسی اختلافات ہیں۔ انہوں نے یہ واضح کیا کہ ایران کے ساتھ افغانستان کا نہ تو کوئی تنازعہ ہے اور نہ ہی اختلاف رائے ہے۔ اس حکومت نے ہر چیز میں گڑ بڑ پیدا کر دی ہے۔ افغانستان میں جو تبدیلی ہوئی ہے اس کے بارے میں اس حکومت کا رویہ اشتعال انگیز اور افسوسناک ہے۔ اس حکومت کا طریقۂ کار احمقانہ ہے اور حماقت اس کی عادت ثانیہ ہے۔ ہم نے اس کے طور طریقوں کی منطق کو دیکھا ہے جو سراسر پاکستان کیلئے نقصان کا باعث ہے۔ اس کی منطق اس کے غیر منطقی ہونے کا خلاصہ یا دلیل ہے۔

تاریخی، جغرافیائی اور نسلی اسباب کے باعث صوبہ سرحد اور بلوچستان کا مسئلہ غیر ملکی سایہ کے تحت چلا گیا ہے۔ اس کا تعلق ان تین جنگوں سے ہے جو انگریزوں نے افغانستان سے لڑی تھیں۔ جو بات چیت برطانیہ اور افغانستان کے درمیان بھارت اور پاکستان کی آزادی سے پہلے ہوئی تھی وہ بغیر کسی تعلق کے نہیں تھی۔

بلوچستان کا ایک حصہ تو پاکستان میں ہے جبکہ دوسرا حصہ ایران میں ہے۔ بلوچستان کا ایک چھوٹا سا حصہ افغانستان میں بھی ہے اور روس میں بھی ہے جب تک

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

کہ میں نے قبائلی علاقوں کے بارے میں پالیسی تبدیل نہیں کی تھی ان حساس علاقوں کے ساتھ پاکستان کی سابقہ حکومتوں نے غیر ملکیت والے علاقوں کا سا سلوک کیا تھا۔ غیر ملکی عنصر نے خواہ اس کی کوئی بھی اہمیت ہو اس مسئلے کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیا۔ اس سبب سے خودمختاری کے اندرونی یا داخلی مطالبہ کی بھی وسیع تر تشہیر ہوئی اور اس پر زیادہ توجہ مبذول کی گئی۔ اس کے علاوہ بلوچستان کی فوجی نقطۂ نگاہ سے اہمیت (خصوصاً ۱۹۷۳ء کے تیل کے بحران کے بعد) اس مجموعی صورت حال میں ایک اہم عنصر تھی۔

جن لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ایک یونٹ (صوبہ) تو پاکستان کیلئے اللہ تعالیٰ کی ایک عطا کردہ نعمت ہے اور جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ خودمختاری کا مطالبہ ''مسلم قومیت'' کے تصور کے برعکس و منافی ہے ان کے خیال میں تو صرف بلوچستان اور صوبہ سرحد ہی ''مسلم قومیت'' کے بگڑے ہوئے بچے نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک سندھ کا خودمختاری کا مطالبہ بھی محض شوروشغب پر مبنی ہے۔ درحقیقت سندھ میں ذیلی قومیت کا جذبہ زیادہ شدید نوعیت کا تھا۔ سیاسی اور علمی نقطۂ نگاہ سے سندھ ان جذبات کے اظہار میں بلوچستان اور صوبہ سرحد سے آگے تھا۔ یہاں بھی سیاسی اثرات کے علاوہ تاریخی اور اقتصادی عوامل نے اپنا کھیل کھیلا۔ سندھ کے مسئلہ کی حالانکہ وہ کچھ لحاظ سے صوبہ سرحد اور بلوچستان کے مقابلہ میں زیادہ شدید نوعیت کا تھا اس قدر زیادہ تشہیر نہیں ہو سکی، اس لئے کہ نسلی اور دوسرے متعلقہ معاملات کو صوبہ سرحد اور بلوچستان کی طرح پڑوسی ممالک میں رسائی حاصل نہیں ہو سکی۔ اس کے علاوہ سندھ میں ذیلی قومی جذبہ سندھ آبادی ہی تک محدود رہا اور صوبہ میں غیر سندھی آبادی اس میں شریک نہیں ہوئی۔ غیر سندھی آبادی کا زیادہ تر اجتماع کراچی،

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

حیدر آباد اور سکھر جیسے اہم شہروں تک محدود رہا۔ چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بھی غیر سندھیوں کی تعداد سندھیوں کے مقابلہ میں زیادہ تھی۔ وہ کافی اقتصادی طاقت کے مالک تھے۔ زیادہ بہتر طور پر منظّم تھے۔ سول سروسز اور مسلح افواج میں ان کے اچھے قدم جمے ہوئے تھے۔ دوسری باتوں کے علاوہ ان وجوہات کی بناء پر یہ خیال کیا گیا کہ سندھ کی ذیلی قومیت والے نعروں کو بغیر کسی مشکل کے دبایا جا سکتا ہے۔

سندھو دیش کی تحریک کو اس لئے سنجیدگی سے نہیں لیا گیا کہ اس کے غیر ملکی روابط نہیں تھے اور وہ اندرونی طور پر گھیرے میں تھی لیکن اس کی اہمیت کو کم سمجھنا غلطی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ سندھو دیش تحریک میں غیر ملکی بلیک میل کا عنصر غائب تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس حساس مسئلے کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ یا ذیلی قومیت کے جذبہ کو فوجی طاقت کے ذریعہ کچلا جا سکتا ہے۔ ۱۸۴۳ء میں سندھ کی فتح کے عرصہ بعد تک سندھ بمبئی پریزیڈنسی کے ساتھ وابستہ رہا۔ صرف ۱۹۳۶ء میں وہ بمبئی پریزیڈنسی سے علیحدہ ہوا۔ سندھ کے بہت سے علاقوں میں کافی تعداد میں ہندوؤں کی آبادی ہے۔ تھر پارکر کے ضلع میں جو بھارتی صوبہ راجستھان کی سرحد کے ساتھ ہے ہندو کچھ سب ڈویژنوں میں اکثریت میں ہیں۔ تھر پارکر کے ٹھاکر اور رانا اپنے علاقہ میں بڑے بااثر ہیں۔ ان کے ازدواجی اور دوسری رشتہ داری کے تعلقات راجستھان کے حکمراں شہزادوں کے ساتھ ہیں۔ سرحد کی دونوں جانب حر اور مہر ہیں۔ اس بات کا علم تمہارے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا کہ ۱۹۶۵ء کی پاکستان، بھارت جنگ میں جس آخری مقام پر پاکستانی فوج نے قبضہ کیا تھا وہ ''بھٹو والی'' تھا جو راجستھان میں ہے۔

سندھ اور راجستھان کے درمیان جن روابط کی وابستگیوں کا مختصر طور پر یہاں

ذکر کیا گیا ہے وہ خواہ کتنی ہی کم ہوں لیکن بھارت کے مقاصد وعزائم ان کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ بھارت نے بھارت ماتا کی تقسیم کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا ہے۔اس نے دیکھا ہے کہ وہ مشرقی پاکستان میں جارحیت کا ارتکاب کرنے میں کامیاب رہا۔ جیسے ہی بنگالیوں کا خودمختاری کا نعرہ ایک جنگی نعرہ بن گیا۔ مشرقی پاکستان کی غیر بنگالی آبادی کی اس وقت کوئی بھی اہمیت نہیں رہی جب سارا کھیل بگڑ گیا۔سندھی ہندو جو بھارت منتقل ہو گئے ہیں ان کا بھارت کے اعلیٰ طبقہ کے لوگوں میں کافی اثر ورسوخ ہے۔ جب جنتا پارٹی نے مارچ ۱۹۷۷ء میں انتخابات جیتے تھے تو وزیراعظم کی نامزدگی کا معاملہ دو معمر بھارتی لیڈروں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک تو جے پرکاش نرائن تھے اور دوسرے اچاریہ کرپلانی تھے جو سندھی ہندو تھے۔ تقسیم ہند کے وقت جب سندھ کے ہندو بھارت جا رہے تھے تو اچاریہ کرپلانی سندھ آئے تھے تا کہ ان لوگوں کی منتقلی میں مدد کریں۔قائداعظم نے انہیں ایک پیغام بھیجا تھا جو سندھ کے ہندوؤں کو سندھ کو خیر باد کہنے کی حوصلہ شکنی کرتا تھا نہ کہ ان کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔اچاریہ کرپلانی کا طنز آمیز جواب تھا کہ ''شان سا دیندا ادن مان سا ایندا'' ایک اور سندھی ہندو مسٹر ادوانی نئی دہلی کی جنتا حکومت میں وزیر اطلاعات ہیں۔اسی طرح بااثر سندھی ہندو انڈین نیشنل کانگریس میں ہیں۔ ۱۹۷۱ء کی پاک، بھارت جنگ میں بھارتی فوج نے حتمی سیاسی،فوجی مقصد کے تحت سندھ سیکٹر پر اجتماع کیا تھا۔ بھارت کے طویل المیعاد اور غیر مصالحانہ مقاصد کے پیش نظر یہ بات ذرا بھی حیرت کا باعث نہیں تھی کہ افغانستان کی نئی حکومت کو تسلیم کرنے والی حکومتوں میں بھارت کی حکومت کا دوسرا یا تیسرا نمبر تھا۔اس صورت حال کا طائرانہ جائزہ لیتے ہوئے میں نے کراچی کی بندرگاہ کی اہمیت پر روشنی نہیں ڈالی ہے اور نہ ہی

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

سندھ کی بڑی بلوچ آبادی کے بارے میں کچھ کہا ہے۔ جو غیر سندھیوں کے زمرہ میں نہیں آتی۔ اور نہ ہی اندرون سندھ کی پختون آبادی کا ذکر کیا ہے جو غیر سندھیوں میں شامل نہیں ہیں اور نہ ہی کراچی میں پختون مزدوروں کی بہت بڑی تعداد کے بارے میں کچھ کہا ہے۔

جب میں پاکستان کا صدر بنا تو سندھو دیش تحریک عروج پر تھی۔ پاکستان پر میرے ساڑھے پانچ سالہ کنٹرول کے دوران میں نے رفتہ رفتہ لیکن بڑی حد تک اس علیحدگی کے جذبہ کو غیر مؤثر بنا دیا اور نوجوانوں کے خیالات کو پاکستانی قومیت کے اصل دھارے کے اندر سمو دیا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں میری پارٹی نے جو قومی پیغام کی علمبردار تھی سندھو دیش کی تحریک کے دیوتا کو ۳۰ ہزار سے زائد ووٹوں سے شکست دی اور ایسا خود اس کے حلقۂ انتخاب میں کیا۔ یہ ایک زبردست کامیابی تھی جو سندھو دیش تحریک کی آگ کو بجھا سکتی تھی۔ میں پھر کہتا ہوں کہ یہ ایک بڑی طاقتور تحریک تھی اور مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہے کہ اس کا احیا اب اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ بارہ مہینوں کے عرصہ میں اس تحریک نے تقریباً وہ سب کچھ دوبارہ حاصل کر لیا ہے جو اس نے کھو دیا تھا۔

مارشل لاء حکومت جو صرف طاقت پر بھروسہ کرتی ہے اور بھارت کو خوش کرنے کی کوشش کر رہی ہے یہ خیال کرتی ہے کہ یہ سارے مسائل اس کے کنٹرول میں ہیں۔ افغانستان میں غیر متوقع تبدیلی نے شرع میں تو اس حکومت کو چیخنے چلانے پر مجبور کر دیا لیکن اب جبکہ ۲۸ اپریل ۱۹۷۸ء کو آسمان نہیں ٹوٹ پڑا اس لئے اب حکومت نے اپنے چیلے چانٹوں کی زیادہ پرامید توضیحات کو قبول کر لیا ہے اور اس نے اپنے کھوئے ہوئے توازن کو بظاہر دوبارہ حاصل کر لیا ہے۔ اول تو فوجی جنتا کو شروع

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

میں ہی شور شرابا نہیں کرنا چاہیئے تھا اور نہ ہی اسے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیئے تھا کہ وہ اس ملک کے عوام کو سزا دینے کیلئے واپسی کا راستہ اختیار کرسکتی ہے۔ آسمان تو نہیں گرا کرتا ہے۔ میں افغانستان میں تبدیلی کے باعث خوفزدہ نہیں ہوں۔ افغانستان میں تبدیلی کے باعث مجھے تو کوئی تعجب نہیں ہوا۔ حالانکہ میری رائے میں اس ملک کا انقلاب ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے دولخت ہو جانے کے بعد اس خطہ میں رونما ہونے والا سب سے بڑا واقعہ ہے پھر بھی مجھے یقین ہے کہ پاکستان کا مستقبل اس صورت حال سے قطع نظر متوازن صورت حال سے دوچار ہے۔ صدر داؤد بھی مجمع میں شامل ہو جاتے یا اسی رائے کے حامی ہوتے۔

پاکستان کیلئے ایران کی حمایت زیادہ قابل قدر ہے لیکن ایران غیر جانبدار ہوسکتا ہے۔ اگر پاکستان میں عوام کی طرف سے وسیع پیمانہ پر اس کے خلاف ناراضگی کا اظہار کیا جائے۔ من مانی طور پر علیحدہ حق رائے دہی کے نفاذ کے باعث اقلیتوں کے ساتھ بہت زیادہ امتیازی سلوک کیا گیا ہے۔ یہ فیصلہ حکومت کی اس سوچ کی نمائندگی کرتا ہے کہ آیا انتخابات منعقد کئے جائیں یا نہیں۔

کارکن طبقات فوجی جنتا کی رجعت پسند اور روشن خیالی کی مخالف پالیسیوں کے باعث برگشتہ ہیں۔ فوجی جنتا کا عوام کے ساتھ کوئی رابطہ وتعلق نہیں ہے۔ سیاسی سرگرمیوں کی ممانعت ہے۔ صحافیوں کے ساتھ برا سلوک کیا گیا ہے۔ سیاستدانوں کو بلا امتیاز جیلوں میں بھر دیا گیا ہے۔ سیاسی کارکنوں کو کوڑے مارے گئے ہیں۔ طلبہ کے جذبہ کو کچل دیا گیا ہے اس لئے کہ اسے انتشار اور گڑبڑ کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے۔ عورتوں کو چادروں میں جکڑ دیا گیا ہے۔ اعلیٰ حکام اور پولیس والے کسی نگراں کنٹرول کے بغیر کام کررہے ہیں۔ رشوت اور بدعنوانیوں میں بے حد اضافہ ہو گیا ہے۔

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

حکومت کے پی این اے کے دوستوں کو بھی دھوکہ دیا گیا ہے اور فوجی جنتا نے انہیں چکمہ دیا ہے۔ ان کو فوجی حکومت کو دوام بخشنے کے لئے ناجائز طور پر استعمال کیا گیا اور مجھ سے نجات حاصل کرنے کیلئے ان کو حکومت کی کوششوں میں آسانی پیدا کرنے کیلئے استعمال کیا گیا۔ اقتصادیات گڑبڑ کا شکار ہے۔ سارے اداروں کو ختم کر دیا گیا ہے۔ پارلیمنٹ ایسی ہی بے جان ہے جیسے کہ دروازہ کی کیل بے جان ہوتی ہے۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کو چھ فٹ زمین کے اندر دفن کر دیا گیا ہے۔ حکومت ہر جگہ ناکام ہو گئی ہے۔ اس کی شیروانی استعمال کرنے کی مہم بھی ناکام ہوگئی ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ حکومت تنہا ہے اور اس سے عوام نفرت کرتے ہیں ایران کس طرح اس حکومت کو غیر ملکی مداخلت کی صورت میں بچا سکتا ہے؟ اس قسم کی صورت حال میں یا تو ایران علیٰحدہ یا غیر جانبدار رہنے کیلئے مجبور ہوگا یا پھر وہ ایران کے مفادات اور اس کی سالمیت کے تحفظ کی خاطر مداخلت کرے گا۔

یہ خیال کرنا تو نری حماقت بلکہ دیوانہ پن ہے کہ چونکہ جنرل ضیاء الحق نے بھارت کو ''ایک پیارا اور عظیم پڑوسی'' کہہ دیا ہے۔ اس لئے بھارت کو موجودہ قیادت الگ کھڑی دیکھتی رہے گی اور دوسرے اس کے حصے بخرے کرتے رہیں گے۔ جنرل ضیاء الحق خواہ بھارت کو خوش کرنے کیلئے کچھ ہی کریں اور خواہ کشمیر کے بارے میں خفیہ شرائط کی بات کریں جن کا کوئی وجود نہیں ہے بھارت، پاکستان سے پورا پورا فائدہ حاصل کر کے رہے گا۔ ۱۲ جون ۱۹۷۸ء کو بھارتی وزیراعظم نے امریکہ میں کہا کہ چین کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی خاطر بھارت چین کے خلاف اپنے سرحدی علاقہ کے دعوے کو ترک کر دے گا۔ صرف دو مہینے پیشتر بھارتی وزیراعظم نے پاکستانی صحافیوں سے کہا تھا کہ بھارت چین سے وہ علاقہ دوبارہ حاصل کرنے پر اصرار کرے

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

گا جس کو وہ لداخ میں بھارتی علاقہ کہتے ہیں۔اس غیر مفاہمانہ یا غیر مصالحانہ رویہ کا اظہار افغانستان میں انقلاب سے پہلے کیا گیا تھا۔ دو مہینے بعد یہ مخالف رویہ چین کو غیر جانبدار بنانے کی غرض سے اختیار کیا گیا ہے تا کہ پاکستان پر کئی جانب سے حملہ کی صورت میں چین غیر جانبدار ہو جائے ۔ اسی بات کو ایک پختون لیڈر نے ۱۹۷۲ء میں ''پاکستان کی تین طرفہ تقسیم'' کہا تھا۔ پاکستان کا خاتمہ تو بھارت کا ایک مقدس اور غیر متزلزل مشن تھا۔ یہ خیال کرنا تو انتہائی حماقت ہوگی کہ کشمیر یا سلال بند یا تجارت کے بارے میں بھارت کو خوش کرنے سے بھارت باقیماندہ پاکستان پر اپنی حریصانہ نگاہیں ڈالنا بند کر دے گا۔

اس کے برعکس مراعات تو بھارت کی بھوک یا طمع میں اور بھی اضافہ کرتی ہیں مصالحت و مفاہمت اور اپنے حقوق و مفادات سے دست برداری تو بھارتی قیادت کو اور زیادہ یقین دلاتی ہے کہ پاکستان ایک خوددار قوم کی حیثیت سے باقی رہنے کا عزم کھو چکا ہے ۔ بھارتی مداخلت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے ۔شک صرف اس بارے میں ہے کہ مداخلت کرنے والی طاقتوں کے درمیان پاکستان کے چاروں صوبوں کی تقسیم کس طرح ہو۔آج کل مرار جی ڈیسائی اور اٹل بہاری باجپائی کان کے کچے مارشل لاء حکمرانوں کے کانوں میں میٹھے اور سریلے الفاظ بول رہے ہیں۔ یہ صرف انکی چال ہے۔ باجپائی جن سنگھ کا لیڈر رہا ہے۔خواہ وہ آج کل کچھ بھی کہے نہ تو اس کے اور نہ ہی جن سنگھ کے تعارف کی کوئی ضرورت ہے۔ جہاں تک مرار جی ڈیسائی کا تعلق ہے تحریک پاکستان کے معمر سیاستدان اس امر کی تصدیق کرنے کیلئے ابھی زندہ ہیں کہ سردار ولبھ بھائی پٹیل کو چھوڑتے ہوئے کوئی دوسرا کانگریسی لیڈر پاکستان کا اس قدر مخالف نہیں تھا جس قدر بھارت کے موجودہ وزیر اعظم تھے۔ نہرو

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

اور اندرا گاندھی کی شہرت زیادہ وسیع القلب اور روادار ہونے کی تھی۔ ان کو اس قدر متعصب نہیں خیال کیا جاتا تھا جس قدر پٹیل اور ڈیسائی کو متعصب سمجھا جاتا تھا۔

اس سلسلہ میں صدر رچرڈ نکسن نے اپنی حالیہ شائع شدہ یادداشتوں میں پاکستان کے بارے میں بھارتی لیڈروں کی دغابازی اور مکاری کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کو یہاں نقل کرنا مناسب ہوگا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں کہ:۔

''۴ نومبر کی صبح کو میں نے اوول آفس میں بھارت کی وزیراعظم اندرا گاندھی سے ملاقات کی۔ ان کا واشنگٹن کا دورہ ایک نازک وقت میں ہوا تھا۔ آٹھ مہینے قبل مشرقی پاکستان میں صدر یحییٰ خان کی حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی تھی۔ بھارتی حکام نے اطلاع دی تھی کہ تقریباً ایک کروڑ مہاجرین مشرقی پاکستان سے فرار ہو کر بھارت میں داخل ہو گئے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ یحییٰ خان کو بالآخر مشرقی پاکستان کے آزادی کے مطالبہ کو ماننا پڑے گا اور ہم نے ان پر زور دیا تھا کہ وہ زیادہ مصالحانہ اور اعتدال پسند رویہ اختیار کریں۔ ہمیں یہ علم نہیں ہو سکا تھا کہ بھارت کس حد تک اس موقع کو نہ صرف مشرقی پاکستان میں پاکستان کے کنٹرول کو ختم کرنے کیلئے استعمال کرے گا بلکہ وہ مغربی پاکستان کو بھی کمزور کرنے کیلئے اس موقع کو استعمال کرے گا۔''

''مسز گاندھی نے میری بے حد تعریف کی کہ میں ویتنام کی جنگ کو سمیٹ رہا ہوں اور چین کے معاملہ میں جرأت مند اقدام کر رہا ہوں۔ ہم نے پاکستان کی مشکل صورت حال پر بات چیت کی اور میں نے اس بات پر زور دیا کہ یہ امر انتہائی اہم ہے کہ بھارت کوئی ایسا اقدام نہ کرے جو اس صورتحال کو اور زیادہ خراب کردے۔''

 Copyright © www.bhutto.org

''انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ بھارت کا مقصد پاکستان کے خلاف کسی قسم کی کارروائی کرنے کا نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ بھارت، پاکستان کی تباہی یا اسے مستقل طور پر مفلوج و ناکارہ کر دینے کی کوئی خواہش نہیں رکھتا۔ سب سے بڑھ کر بھارت استحکام کی بحالی چاہتا ہے۔ ہم ہر قیمت پر گڑبڑ اور افراتفری کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔''

''بعد میں مجھے علم ہوا کہ جس وقت مسز گاندھی نے یہ باتیں کہیں انہیں بخوبی علم تھا کہ ان کے جنرل اور مشیر مشرقی پاکستان میں مداخلت کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں اور مغربی پاکستان پر حملہ کرنے کے ہنگامی بنیاد پر منصوبے تیار کر رہے ہیں۔''

''اس صبح کو ہماری جو گفتگو ہوئی اس سے میں اس حقیقت کے باعث پریشان ہوا کہ حالانکہ مسز گاندھی نے امن کیلئے اپنی خواہش کا اظہار کیا لیکن انہوں نے ہیجان و خلفشار کو بڑھنے سے روکنے کیلئے کوئی تجاویز پیش نہیں کیں۔ یحیٰی خان نے اس بات سے اتفاق کر لیا تھا کہ وہ بھارتی سرحد سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں گے۔ اگر بھارت بھی ایسا کرے لیکن مسز گاندھی نے اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کیا۔''

''ایک ہی مہینہ کے بعد روسی اسلحہ سے لیس ہو کر بھارتی فوج نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ مغربی پاکستان کی سرحد کے ساتھ بھی جنگ کا آغاز ہو گیا لیکن یہ بتانا ناممکن تھا کہ آیا بھارت کا مقصد پاکستانی فوج کو اسی مقام پر محدود رکھنا تھا جہاں وہ تھی یا یہ کارروائی پاکستان پر پورے حملہ کا پیش خیمہ تھی۔ اس قسم کے فوجی منصوبے ایک مہینہ سے کم میں تیار نہیں کئے جاتے ہیں اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ مسز گاندھی نے جان بوجھ کر اس ملاقات میں مجھ سے دھوکہ بازی کی تھی۔''

صدر نکسن کا یہ تبصرہ ان کی یادداشتوں کے صفحات ۵۲۵ اور ۵۲۶ پر مندرج ہے۔ اگر لبرل ذہن رکھنے والی مسز گاندھی صدر نکسن جیسے زیرک اور تجربہ کار سیاستدان کو پاکستان کے بارے میں بھارت کے رویہ کے متعلق دھوکہ دے سکتی تھیں تو ہم تصور کر سکتے ہیں کہ متعصب قسم کے جنتا پارٹی کے لیڈر کس طرح نا تجربہ کار مارشل لاء حکمرانوں کو پاکستان کے بارے میں اپنی ڈپلومیسی کے متعلق دھوکہ دے سکتے ہیں۔

اس فوجی حکومت کو تو یہ بھی علم نہیں ہے کہ اس کی ناک تلے کیا ہو رہا ہے۔ اس کی نشاندہی وزیراعظم کے سیکریٹریٹ کے جلانے سے ہوئی جو مارشل لاء حکمرانوں کی ناک تلے ہوئی۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ مکمل امن و چین ہے اس لئے کہ سیاسی سرگرمیوں کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ سیاسی سرگرمیوں کو ختم نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ ''آدمی ایک سیاسی جانور ہے۔'' اور ریاست ایک سیاسی تھیٹر ہے۔ سیاسی سرگرمیاں یا تو سطح پر رہتی ہیں اور یا زمین دوز ہوا کرتی ہیں۔ اس رفتار سے بہت ہی کم عرصہ میں اٹلی کے ریڈ بریگیڈ کی طرح پاکستان میں بھی اپنی قسم کے ریڈ بریگیڈ پیدا ہو جائیں گے۔ سیاسی سرگرمیوں کو ممنوع قرار دے کر یہ حکومت دہشت گردی کی پرورش کر رہی ہے۔ اگر سیاسی سرگرمیوں کو ڈومینیکن ری پبلک جیسے چھوٹے سے ملک میں ختم نہیں کیا جا سکتا تو پھر انہیں پاکستان جیسے ملک میں کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے؟ روایتی سیاسی سرگرمیوں کو ممنوع قرار دینا درحقیقت ان لوگوں کو دعوت دینا ہے جو اقتدار پر قبضہ خفیہ طور پر اعتماد حاصل کر کے کرتے ہیں۔ مارشل لاء حکومت فرینکسین کا تجربہ رہی ہے۔ سیاسی منظر پر اس کی مداخلت یا اس کے دخول نے خطہ میں پاکستان کو غیر مستحکم کر دیا ہے۔ کڑوے پھلوں کی فصل ابھی کاٹنا باقی ہے۔

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

جب سپریم کورٹ تمہاری والدہ کی آئینی درخواست کی سماعت کر رہا تھا تو میں نے عدالت سے کہا تھا کہ اگر آئین کو غیر معینہ مدت کیلئے التواء میں یا معطل رکھا جاتا ہے تو اس کا نتیجہ پاکستان کیلئے مہلک ہوگا۔ میں نے عدالت پر زور دیا تھا کہ وہ عام انتخابات کی تاریخ مقرر کرے اور اس امر کو یقینی بنائے کہ کم سے کم ممکنہ وقت کے اندر آئینی قانون مارشل لاء کی جگہ لے لے۔ ان حالات میں، مَیں نے دلیل پیش کی تھی کہ مارشل لاء کو جائز قرار دینے کے افسانہ کو ایک برے خواب کی طرح قبول کیا جا سکتا ہے۔ ایک کڑوی گولی کی طرح نگلا جا سکتا ہے۔ ایک ڈراؤنے خواب کی مانند خیال کیا جا سکتا ہے جو گزر چکا ہے۔ میں نے واضح کر دیا تھا کہ اگر درمیانی مدت مختصر نہ ہوئی اور کم از کم عرصہ کی نہ ہوئی تو لوگ یہی خیال کریں گے کہ آئین منسوخ کر دیا گیا۔ وہ اس کے معطل کئے جانے یا اس سے انحراف کئے جانے کے قانونی افسانہ کو قبول نہیں کریں گے۔ اس صورت میں یہ دلیل دی جا سکے گی کہ پاکستان ۱۹۴۷ء کی حالت پر واپس چلا گیا ہے اور اب اس کا وجود اس آئین کے مطابق نہیں ہے جس کو پاکستان کے عوام نے ۱۹۷۳ء میں منظور کیا تھا بلکہ اس کا وجود ۱۹۴۷ء کے آزادی ہند کے قانون کا مرہون منت ہے۔ جس کو برطانوی پارلیمنٹ نے منظور کیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں یہ دلیل دی جا سکے گی کہ صوبائی خودمختاری کی وہ حد جس کو صوبوں نے از خود وفاق کے سپرد کر دی تھی۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کے منسوخ کئے جانے کے باعث صوبوں کو واپس مل گئی۔ بدقسمتی سے سپریم کورٹ نے میرے انتباہ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ مارشل لاء ضرورت سے زائد مدت تک برقرار رہا ہے۔ وہ ایسا مہمان ہے جس کا کبھی بھی خیر مقدم نہیں کیا گیا۔ یہ دلیل دینا تو مضحکہ خیز ہے کہ ۱۹۷۳ء کا آئین اب بھی باقی اور برقرار ہے۔ تقریباً ایک سال سے اس پر عمل نہیں ہو رہا ہے۔ انتخابی نظام

Copyright © www.bhutto.org

کے بارے میں اس کے بنیادی کلازوں میں ایک آدمی نے من مانی طور پر ترمیم کی ہے۔ یہی شخص اپنا قلم اٹھا کر آئین میں چھوٹی بڑی ترمیمات کرسکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مستقبل قریب میں آئین کی شکل کو بگاڑنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اخلاقی اور سیاسی صورت حال یہ ہے کہ ۱۹۷۳ء کا آئین ہوا کے جھونکے کے ساتھ اڑ گیا ہے یعنی ختم ہو چکا ہے۔ یہی قانونی پوزیشن بھی ہے۔ اب پاکستان ۱۹۴۷ء کے ہندوستان کی آزادی کے قانون کی جانب مراجعت کرے گا جس کو برطانوی پارلیمنٹ نے منظور کیا تھا۔ صوبائی خودمختاری کی وہ مقدار جو صوبوں نے اپنی مرضی ومنشا سے پاکستان کے وفاق کو سپرد کی تھی اب پھر صوبوں کو واپس مل گئی ہے۔ اگست ۱۹۷۶ء میں ڈورنڈ لائن کے بارے میں میرا جو معاہدہ صدر داؤد کے ساتھ ہوا تھا اس سے یا تو صدر داؤد جنرل ضیاء الحق کی مرضی سے بعد میں منحرف ہو گئے یا پھر نا قابل وضاحت وجوہ کی بنیاد پر اس کو عوام سے چھپالیا گیا۔ تو پھر ہم کہاں کھڑے ہیں؟

۱۔ ملک بغیر آئین کے ہے۔

۲۔ پاکستان کا وجود ۱۹۴۷ء کے ہندوستان کی آزادی کے قانون کے باعث ہے جس کو برطانوی پارلیمنٹ نے منظور کیا تھا۔

۳۔ دونوں ہی صورتوں میں صوبوں کو وہ خودمختاری دوبارہ حاصل ہو گئی ہے جو ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت انہوں نے وفاق پاکستان کو سپرد کی تھی۔

۴۔ افغانستان ڈورنڈ لائن کو تسلیم نہیں کرتا۔

۵۔ افغانستان کا مؤقف ہے کہ بلوچوں اور پختونوں کا مسئلہ پرامن طریقہ سے پاکستان کے ساتھ طے کیا جانا ہے۔ اس کے علاوہ افغانستان کا مؤقف ہے کہ

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

یہ مسئلے صرف پاکستان کے ساتھ نہ کہ ایران کے ساتھ طے ہونا تھا۔

۶۔ بھارت اپنی شرائط پر کشمیر کا سمجھوتہ کرنا چاہتا ہے۔

۷۔ بھارت نے چین کے خلاف علاقائی دعوے کو ترک کر دیا ہے اور وہ چین کے ساتھ دوستی چاہتا ہے۔

۸۔ روس نے افغانستان کی نئی حکومت کی مکمل حمایت کا وعدہ کیا ہے۔

۹۔ روس نے پاکستان کی سیٹو میں شمولیت پر تنقید کی ہے۔

۱۰۔ شہنشاہ ایران نے متنبہ کیا ہے کہ اگر ایران میں گڑ بڑ جاری رہی تو تودہ پارٹی کو فائدہ پہنچے گا۔

۱۱۔ بھارت اپنی ایٹمی پالیسی کے ذریعہ اپنی سربراہی و برتری کے حقوق جتا رہا ہے۔اس نے ایشیائی خطۂ امن کی پاکستان کی تجویز کو مسترد کر دیا ہے۔

۱۲۔ پاکستان کے عوام غیر مطمئن۔ ہیجان میں مبتلا اور سخت مایوسی کے عالم میں ہیں اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ گارڈین نے پاکستان کے بارے میں لکھا ہے کہ پاکستان ایسا ملک ہے ''جس کے پاس مسائل کا حل نہیں ہے۔''

پھر تقریباً تیس سال کے عرصہ میں یہ تباہ کن صورت حال کس طرح پیدا ہوئی؟ یہ اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ ۱۹۵۴ء کے بعد تباہ کن لوگ فوجی جنتا کے نمائندوں کی حیثیت سے پاکستان کی سیاست میں براہ راست ملوث رہے ہیں۔ جنرل ایوب خان ۱۹۵۴ء میں مرکزی وزیر ہو گئے اور فوجی جنتا نے ۱۹۵۲ء میں ڈارچیسٹر ہوٹل میں ایک یونٹ اسکیم تخلیق کی۔غریب ڈارچیسٹر ہوٹل! میں اس ہوٹل میں ۱۹۵۰ء سے قیام کرتا رہا ہوں جب میں آکسفورڈ میں ایک طالبعلم تھا۔اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ

ڈار چیسٹر ہوٹل ایک یونٹ کا ذمہ دار ہوگا۔ پھر بلا شرکت غیرے یا خالص فوجی حکومت ۱۹۵۸ء میں قائم ہوئی اور اس وقت دفان ہوئی جب ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان علیحدہ ہوا۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو وہ پورے کروفر اور غیظ وغضب کے ساتھ پاکستان کو ''بچانے'' کی غرض سے دوبارہ واپس آ گئی، بالکل اسی طرح جس طرح اس نے ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کو ''بچایا'' تھا۔ مارشل لاء بالکل غیر نمائندہ نہیں ہوتا ہے۔ وہ عوام کی تو نمائندگی نہیں کرتا ہے لیکن وہ رجعت پسند فوجی ٹولہ کی نمائندگی ضرور کرتا ہے۔ اس ٹولہ اور اس کے نمائندوں نے یعنی یکے بعد دیگرے فوجی جنتاؤں نے اس ملک کو اس افسوسناک حالت پر پہنچا دیا ہے۔ برصغیر میں سندھ وہ پہلا صوبہ تھا جس نے اپنی قانون ساز اسمبلی میں قرارداد پاکستان منظور کی تھی۔ آج سندھ خوفناک حد تک تلخ لہجہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ بلوچستان بغیر صوبائی حیثیت کے (چہ جائیکہ صوبائی خودمختاری کے) دوعشروں تک بالکل پرسکون رہا۔ ۱۹۵۸ء میں ایوب خاں کے مارشل لاء کی بلوچ آبادی کے ساتھ محاذ آرائی، سرداری نظام یا زرعی اصلاحات یا دوسری اصلاحات کے باعث نہیں ہوئی بلکہ چھوٹے چھوٹے سیاسی مسائل پر ہوئی جو ذاتی نوعیت کے تھے۔ لوروز خان بروہی کو قرآن پاک کی قسم پر پہاڑوں سے اتارا گیا کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ لیکن پھر حیدرآباد میں اسے پھانسی دے دی گئی۔

یہ ٹولہ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ ۱۹۶۳ء یا ۱۹۶۴ء میں ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کے اجلاس میں ایک تقریر کے دوران میں نے اس ٹولہ پر براہ راست تنقید کی تھی۔ یہ تنقید اس قدر تندوتیز تھی کہ ایک پیر سیاستدان کو (جن کا خیال تھا کہ شجاع آباد ان کی جائے پناہ ہے، یہاں تک کہ میں نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں فتح حاصل کی) اب

تک وہ تقریر یاد ہے۔ اس تقریر سے یہ ٹولہ اس قدر لرزہ براندام ہوا کہ تقریر کا ٹیپ ڈھاکہ سے لاہور ایک خصوصی ایلچی کے ذریعہ بذریعہ طیارہ بھجوایا گیا اور اسے ہدایت کی گئی کہ وہ اس ٹیپ کو ذاتی طور پر ایوب خان کو دے اور ان سے درخواست کرے کہ وہ اسے فوری طور پر سنیں۔

یہ ٹولہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ وہ مجھ سے اس لئے نفرت کرتا ہے کہ میں پاکستان کا وہ پہلا لیڈر رہوں جس نے اس کی اجارہ داری کو پاش پاش کیا ہے اور براہ راست عوام سے رجوع کیا ہے۔ اس ٹولہ میں شامل لوگ یہ چاہتے تھے کہ میں انکے ذریعہ حکومت کروں، جیسا کہ ماضی میں تمام دوسرے لیڈروں نے کیا تھا لیکن میں نے ایسا کرنے سے انکار کردیا۔ میں نے ان کو خون چوسنے والا کہا جنھوں نے پنجاب کے نام پر پنجاب کے عوام کا استحصال کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں پنجاب کے عوام کے پاس جاؤں گا اور پنجاب کے عوام کے سامنے ان کی دھوکہ بازی کی قلعی کھولوں گا اور ایسا ملک کے باقی عوام کے سامنے بھی کروں گا۔ جس طرح کہ اسلام کے نام پر انھوں نے اسلام کو دھوکہ دیا ہے۔ جیسے کہ احتساب کے نام پر وہ احتساب سے بچ گئے ہیں اسی طرح پنجاب کے نام پر انھوں نے پنجاب کے عوام کو دھوکہ دیا ہے۔ مسلم قومیت کے نام پر جس کا سادہ زبان میں مطلب ایک یونٹ (صوبہ) ہوتا ہے وہ نہیں چاہتے کہ پنجاب کے عوام کا پاکستان میں غلبہ ہو۔ وہ پاکستان پر اپنا ذاتی غلبہ چاہتے ہیں جس میں پنجاب بھی شامل ہے۔ پنجاب میں ایک یا دو فیکٹریاں لگا لینے سے یہ ٹولہ پنجاب کے عوام کی خدمت نہیں کرنا چاہتا بلکہ اپنے استحصال کو مستحکم کرنا چاہتا ہے۔ پنجاب کے عوام اور ملک کے باقی عوام کی خدمت کا واحد طریقہ یہ ہے کہ مخصوص مفادات کو ختم کیا جائے اور استحصال کا خاتمہ کیا جائے۔

دوسرے الفاظ میں ایسا اس ٹولہ کو ختم کر کے کیا جا سکتا ہے۔ کیا یہ ٹولہ پنجاب کے عوام کے مفاد میں اپنے آپ کو ختم کر لے گا؟ وہ یقینی طور پر ایسا نہیں کرے گا۔ یہ ٹولہ کبھی بھی پنجاب کے عوام کی خدمت نہیں کرے گا۔ یہ بنیادی تضاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب کے عوام میرے ساتھ ہیں اور ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ اس ٹولہ کا دعویٰ ہے کہ اس نے دریائے راوی کا پانی پیا ہے۔ یہ ٹولہ کہتا ہے کہ میں نے تو دریائے سندھ کا پانی پیا ہے۔ دونوں دریاؤں کا تعلق پاکستان سے ہے۔ دونوں دریاؤں کا پانی اچھا ہے۔ لیکن پانی خون تو نہیں ہے۔ اس ٹولہ نے تو عوام کا خون پیا ہے جبکہ میرے نزدیک عوام کا خون خود میرے خون کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ہے۔ میں کسی قسم کے غلبہ کو قبول نہیں کر سکتا خواہ وہ غلبہ اندرونی ہو یا بیرونی ہو۔ میں عوام کی برتری میں یقین رکھتا ہوں اور عوام سے میری مراد حقیقی عوام ہیں نہ کہ یہ قابل نفرت فوجی ٹولہ ہے۔ ۱۹۷۰ء میں میں پنجاب کے ہر گاؤں گیا۔ پنجاب کے ہر قصبہ اور شہر گیا اور میں نے اس ٹولہ کے غبارے میں سے ہوا نکال دی اور میں پنجاب کے عوام کا غیر متنازعہ لیڈر بن گیا جس طرح کہ ملک کے باقی ماندہ عوام کا میں غیر متنازعہ لیڈر رہوں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ٹولہ مجھ سے نفرت اور حقارت کرتا ہے۔ میں نے ان کی قلعی خود ان کے گھر کے صحن میں کھول دی۔ میں نے پنجاب کے عوام کو شہہ دی کہ وہ اس ٹولہ میں شامل لوگوں کو گردن سے پکڑ کر اور لاتیں مار کر کوڑا گھر میں پھینک دیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ میری گردن مارنا چاہتے ہیں۔

جنرل ضیاء الحق نے حال ہی میں اپنے نافذ کردہ مارشل لاء کا ایک سبب بتایا ہے۔ اس نے ایک امریکی نامہ نگار سے کہا کہ میرا ارادہ اقتدار منتقل کرنے کا نہیں تھا خواہ مجھے انتخابات میں شکست بھی ہو جاتی۔ وہ جلد ہی محسوس کرے گا کہ اس کے

Copyright © www.bhutto.org

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے مطلب پرستی پر مبنی اقدام نے نہ صرف پاکستان کو اور اس خطہ کو غیر مستحکم کیا ہے بلکہ شاید پاکستان کو مستقل طور پر نقصان پہنچایا ہے۔ اگر وہ اپنی خودکشی کرنے والی پالیسیوں کی سمت کو جلد معکوس نہیں کرتا ہے تو از سرنو پیدا شدہ محمد علی جناحؒ بھی بگڑی ہوئی صورت حال کو بچا نہیں سکتے ہیں۔ مارشل لاء کسی بھی مہذب ملک کیلئے ایک سرطان کی مانند ہے۔ پاکستان کے لئے تو مارشل لاء اس کے وجود کے اسباب ہی کی نفی ہے اس لئے کہ پاکستان ایک جمہوری تحریک کے ذریعہ عوام کی تخلیق ہے۔ دوسرے، دنیا میں کوئی بھی ملک اپنے جی این پی کا اس قدر حصہ مسلح افواج پر خرچ نہیں کر رہا ہے جس قدر کہ پاکستان کر رہا ہے۔ دنیا کے ایک غریب ترین ملک کے عوام کی یہ جرأت مندانہ قربانی سال بہ سال جاری ہے۔ مسلح افواج کے حق میں عوام کی اس قربانی کا مقصد یہ ہے کہ مسلح افواج پاکستان کی سالمیت کو جو خطرات لاحق ہیں ان سے نمٹے۔ اس لئے نہیں ہے کہ مسلح افواج پاکستان کی خارجی حیثیت کے بارے میں ملک پر غلبہ حاصل کرنے کیلئے سمجھوتہ کرلیں۔ تیسرے، دنیا کا کوئی اور ملک ایسا نہیں ہے جس کے پڑوسی ملک نے اس کو دنیا کے نقشہ سے نیست و نابود کرنے کا تہیہ کر رکھا ہو۔ اسرائیل اس وقت تک اسی پوزیشن میں تھا جب تک کہ صدر سادات نے یروشلم کا دورہ نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ فوجی لحاظ سے اسرائیل کو برتری حاصل ہے۔ برصغیر میں پوزیشن اس کے برعکس ہے۔ یہاں فوجی لحاظ سے جو ملک پاکستان کو ختم کرنے کے درپے ہے اس کو غالب فوجی برتری حاصل ہے۔ اسلئے پاکستان کی مسلح افواج اپنی اس حقیقی ذمہ داری سے ذرا بھی انحراف نہیں کرسکتی ہیں پاکستان کی سالمیت کی خاطر وہ ملک کی سیاسی زندگی میں اپنے آپ کو نہ تو ملوث کرسکتی ہیں اور نہ

Copyright © www.bhutto.org

ہی اس میں ضم ہو سکتی ہیں۔ وہ فوجی جو فوجی بیرکوں کو خیر باد کہہ دیتے ہیں اور سرکاری محلوں میں رہتے ہیں وہ جنگیں ہار جاتے ہیں اور جنگی قیدی بن جاتے ہیں جیسا کہ ۱۹۷۱ء میں ہوا تھا۔ پاکستانی فوج کے جنرلوں نے اس تاریخ کو دھرانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔

جیمس مارس کی ایک حالیہ کتاب میں جس کا عنوان ''فیئر ویل دی ٹرمپٹس'' (طبل جنگ کو خیر باد) ہے۔ مصنف نے کہا ہے کہ'' قانون کی عملداری عارضی ثابت ہوئی جب شاہی پولیس والوں کو واپس بلا لیا گیا اور کسی بھی نو آبادیاتی گورنر سے زیادہ سخت اور خونخوار ظالموں نے جمہوریت کے چمکدار زیور کو کچل ڈالا۔ جن قوموں کی تربیت ریاستی امور میں کی گئی تھی وہ خانہ جنگی میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں یا پھر بدعنوانی اور رشوت ستانی کی عادی ہو گئیں''۔

ایسا وہاں ہوا ہے جہاں نام نہاد پیشہ ور فوج کے نام نہاد پیشہ ور جنرلوں نے جو سینڈھرسٹ کے تربیت یافتہ تھے سیاسی اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کیا ہے اور سیاست کو وقت گزاری کا ایک عمدہ کھیل سمجھ کر ایسا کیا ہے۔

حالیہ برسوں میں انسانی حقوق کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ اس امر کا تو ابھی تعین ہونا باقی ہے کہ آیا انسانی حقوق بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے خیال سے ڈپلومیسی کے ضابطۂ اخلاق میں شامل کر دیئے گئے ہیں یا ان کو محض موقع محل کی سہولت کی خاطر تنگ نظر مقاصد کی خاطر اپنی پسند کے مطابق استعمال کیا جا رہا ہے۔ ایک اخلاقی اصول کی حیثیت سے انسانی حقوق کے ساتھ وابستگی نمایاں خدمت انجام دے سکتی ہے۔ اگر اس مقصد کی پیروی ذاتی مفادات سے ہٹ کر کی جائے اور

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

فرشتوں کی طرح غیر جانبداری برتی جائے لیکن اگر مقصد موقع محل کی سہولت ہے یا کسی مخالف کو پھانسنا ہے تو وہ ڈپلومیسی میں دوہرے معیار کی طرح خود اپنے ہی اوپر الٹ کر آئے گی۔ چونکہ فوجی جنتا انسانی حقوق کی وحشیانہ نفی ہے اسلئے فوجی جنتا سے انسانی حقوق کے کسی خاص پہلو کا احترام کرنے کی اپیل کرنا ایک طنزیہ صورت حال ہے۔ ایسی صورت میں انسانی حقوق کے احترام کا واحد طریقہ یہی ہے کہ غیر قانونی فوجی جنتا کو تسلیم ہی نہ کیا جائے۔ فوجی ڈکٹیٹروں نے ایشیاء، لاطینی امریکہ اور افریقہ کو روند ڈالا ہے۔ ان کے اس اقدام کے نتیجہ میں انہوں نے مارکس اور اینگل، لینن اور ماؤ کی تصنیفات سے زیادہ کمیونزم کو پھیلانے کیلئے کام کیا ہے۔ وہ بعد کے نو آبادیاتی دور کے بدترین ظالم ہیں۔ انہوں نے قابل احترام اداروں کو تباہ کیا ہے اور اپنے عوام کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا ہے۔

انہوں نے داخلی نفاق اور بیرونی گنجلک پیدا کی ہے۔ ڈکٹیٹر وہ جانور ہے جس کو پنجرہ میں بند کرنے کی ضرورت ہے۔ اس نے اپنے پیشہ اور اپنے آئین سے انحراف کیا ہے۔ اس نے عوام سے دھوکہ کیا ہے اور انسانی اقدار کو تباہ کیا ہے اس نے ثقافت کو تباہ کیا ہے۔ اس نے نوجوانوں کو پابند کر رکھا ہے اس نے حکومتی ڈھانچہ کو تہ وبالا کر دیا ہے۔ وہ محض اپنی مرضی کے مطابق حکومت کرتا ہے۔ وہ ایک قہر ہے جو انسانوں کو ہلاک کرنے والا ہے۔ وہ جذامی ہے۔ جو شخص بھی اسے چھوتا ہے وہ بھی جذامی ہو جاتا ہے۔ وہ ایسا شخص ہے جو یکایک نچلی حیثیت سے اعلیٰ پوزیشن پر پہنچ گیا ہے۔ وہ نظریہ اور اعلیٰ اصولوں سے بے بہرہ ہے۔ اس فوجی جنتا میں سے کسی نے بھی تاریخ کے ایک لحہ کیلئے بھی خدمت انجام نہیں دی ہے۔

ان فوجی ڈکٹیٹروں نے آزادی کیلئے جنگ نہیں لڑی ہے اور نہ ہی وہ کسی نظریہ

Copyright © www.bhutto.org

کے پابند ہیں۔ وہ ایسے سازشی ہیں جو سماجی لحاظ سے نچلے درجہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یکا یک ترقی کر کے اعلیٰ طبقہ میں شمار ہونے لگے ہیں۔ وہ غیر ملکی سفارتکاروں کے ''شو بوائے'' ہیں۔ وہ عوام کا مخالف ایسا پیشہ ور ہے جو ہر چھوٹے سے موقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ اپنے پیشہ کو خیر باد کہہ کر اپنے مالک کے پیشہ کو اپنا لے۔ وہ ایسا شخص ہے جو لوگوں سے متنفر اور بیزار ہے۔ وہ ایسا شخص ہے جو ایک اعلیٰ افسر کی بیساکھی پر بھروسہ کرتا ہے۔ وہ ایسا شخص ہے جو یہ خیال کرتا ہے کہ افراط زر میں ایک یا دو فیصد کی کمی کا مطلب کشمیر کی آزادی ہے۔ کیا وہ اس اعلیٰ افسر سے یہ دریافت کرتا ہے کہ کیا افراط زر میں کمی کے ساتھ روزگار میں بھی اضافہ ہوا ہے؟ ترقی یافتہ ممالک میں افراط زر کو کم کرنا زیادہ لازمی ہوا کرتا ہے خواہ اس کے باعث بے روزگاری میں اضافہ ہو، اس لئے کہ افراط زر سے نو آبادی کا زیادہ بڑا حصہ متاثر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ترقی یافتہ ممالک میں بے روزگاری کے مصائب کو سماجی تحفظ کی اسکیموں کے ذریعہ تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں روزگار کی فراہمی زیادہ اہم ہوا کرتی ہے خواہ ایسا افراط زر کی قربانی دے کر کرنا پڑے اس لئے کہ آبادی کا بڑا حصہ افراط زر کے مقابلہ میں بے روزگاری سے زیادہ متاثر ہوا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ترقی پذیر ممالک میں سماجی تحفظ کی قابل ذکر اسکیمیں بے روزگار لوگوں کیلئے نہیں ہوتی ہیں۔ افراط زر اور بے روزگاری کے درمیان انتخاب کرنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے بارے میں شدید ردعمل ہوا کرتا ہے لیکن اس کا کوئی اعلیٰ ترین حل دستیاب نہیں ہے۔ ترقی یافتہ ممالک اور ترقی پذیر ممالک کے حالات بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ افراط زر اور بے روزگاری دونوں ہی بری چیزیں ہیں اور پریشان کن ہیں لیکن اگر ان دونوں برائیوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

ترقی یافتہ ممالک افراط زر کے مقابلہ میں زیادہ بے روزگاری کو ترجیح دیں گے۔ترقی پذیر ممالک کیلئے یہی بہتر مشورہ ہوگا کہ میرے خیال میں الفاظ یہ ہونے چاہئیں کہ ''وہ افراط زر کے مقابلہ میں بے روزگاری کا انتخاب کریں۔'' وہ بے روزگاری کے مقابلہ میں افراط زر کا انتخاب کریں۔ بہت سے ترقی پذیر ممالک نے مثال کے طور پر برازیل نے عمداً یہ تکلیف دہ انتخاب کر کے ترقی کی ہے۔ کینیسین کے نظریات کا ہو سکتا ہے کہ ان ممالک پر اطلاق نہ ہو جو ترقی کی حدود پھلانگ چکے ہیں لیکن ان کا اطلاق ان ممالک پر نہیں ہوتا ہے جو اقتصادی لحاظ سے اپنے بچپن سے گزر رہے ہیں۔ یہ وہ سوالات ہیں جو ایک فوجی ڈکٹیٹر کے ذہن میں نہیں آسکتے۔ایسے فرد کے نزدیک تو جو چیز دولت مند ممالک کیلئے اچھی ہے وہی غریب ممالک کیلئے بھی اچھی ہے۔وہ دولت مند آدمی کے فارمولہ کو قبول کرتا ہے اس لئے کہ وہ دولت مند آدمی کا آلہ کار ہے۔غرباء کو حقیقی اور کافی سہولت غیر ترقیاتی اخراجات میں کمی کر کے پہنچانی چاہئے۔ایسا کرنا وہاں اور بھی ضروری ہے جہاں غیر ممالک کے ساتھ تنازعات پر سمجھوتہ کیا گیا ہے یا جہاں ان تنازعات کو فوجی ذرائع سے حل کرنا ناقابل تصور ہو۔ اس طرح کی تخفیف افراط زر کی شرح کو کم کر دے گی اور پیداواری روزگار بھی فراہم کرے گی۔کیا اس طرح کے بنیادی اور اہم اور اقتصادی لحاظ سے درست فیصلے کئے جاسکتے ہیں جب بجٹ کا اعلان پارلیمنٹ میں نہیں بلکہ ٹیلیویژن اسٹوڈیو کے آرام دہ کمروں میں کیا جائے؟ فوجی جنتا تو اس قسم کے فیصلے نہیں کرے گی۔اس لئے کہ جنرل تو کنڈرگارٹین کے بچوں کی طرح ہیں۔ان کے کھیلنے کیلئے تو کھلونے چاہئیں۔ جنگی ہتھیار ان کے کھلونے ہیں وہ جنگ نہیں کر سکتے۔وہ جنگ نہیں کریں گے۔تاہم انہیں اسلحہ چاہئے۔ یہ اسلحہ پریڈ گراؤنڈ میں ان کے فخر و وقار کیلئے ہے۔ایسے

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

خوشامدیوں کوخوشامدیوں ہی کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ وہ اندوہناک حقیقت سے دور رہیں کہ ان کی حقیقت نہ کھلے اور وہ ناخوشگوار سچائی کو نہ سن سکیں۔ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ وہ حقیقی مارچ سے خوفزدہ ہیں۔ یہ مارچ خیالات کا مارچ ہے۔ مردوں اور عورتوں کا بغیر فوجی بوٹوں کے مارچ ہے۔ ننگے پیر مردوں اور عورتوں کا مارچ ہے۔ وہ ہر شے کو جیل میں ڈال دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ایک روتے ہوئے شیر خوار بچہ کو بھی جیل میں ڈال دیتے ہیں جو بھوک سے بلبلا کر ماں کے دودھ کیلئے بلکتا ہے۔ ایسا کوٹ لکھپت جیل میں ہوا ہے جب یہ افراد اپنے ملک کے مفادات اور مستقبل کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں تو مغربی طاقتوں کیلئے یہ خیال کرنا ہی ایک حماقت ہے کہ وہ مغربی مما لک کے مفادات کا تحفظ کر سکتے ہیں۔

ایشیاء میں دو مما لک اس قسم کی ڈکٹیٹر شپ میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو تھائی لینڈ ہے اور دوسرا پاکستان ہے۔ تھائی لینڈ کی تشفی تو اس امر سے ہو جاتی ہے کہ وہاں موروثی بادشاہت ہے۔ اس ملک میں آئینی خلاء سے بچا جا سکتا ہے خواہ آئین کو برطرف کر دیا جائے۔ ایسا بادشاہت کی موجودگی کے باعث ہے۔ پاکستان کا سہارا صرف وہ قانون ہے جس کو برطانوی پارلیمنٹ نے منظور کیا تھا۔ اگر پاکستان ۱۹۴۷ء کے آزادی کے قانون کا سہارا لیتا ہے تو برطانوی پارلیمنٹ ہی ۱۹۴۷ء کے آزادی کے قانون میں ترمیم کرنے کی قانونی طور پر مجاز ہے یا پھر وہ اس قانون کے بدلہ میں کوئی دوسرا قانون منظور کر سکتی ہے اور پاکستان کو پھر ایک برطانوی نوآبادی بنا سکتی ہے یا پاکستان کے صوبوں کو دوسری جانشیں ریاستوں میں تقسیم کر سکتی ہے۔ دراصل پاکستان کو سہارا دینے والی کوئی صورت نہیں ہے، اگر اس کا جمہوری آئین برطرف اور مسترد کر دیا جائے۔

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

میرے ذہن میں یہی قانونی بحران تھا۔ جب میں نے قوم کو مارشل لاء کے قانونی طور پر جائز قرار دیئے جانے سے پیدا ہونے والے منحوس نتائج سے متنبہ کیا تھا۔

پیشہ ور فوجی ڈکٹیٹروں کے دماغ ایک جیسے خطوط پر عمل کرتے ہیں۔ ان کا مؤقف اور طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے مجبوراً اور عارضی طور پر فوجی بیرکوں کو خیر باد کہا ہے۔ جن کو وہ ہرگز چھوڑنا نہیں چاہتے اور یہ کہ انہوں نے ایسا ملک کو خانہ جنگی اور کمیونزم کے خطرہ سے بچانے کی خاطر کیا ہے اور گندے سیاستدانوں نے جو گڑبڑ پیدا کی ہے اس کو صاف کرنے کیلئے امن وامان برقرار رکھنے کیلئے، رشوت ستانی کو ختم کرنے کیلئے اور سیاسی استحکام قائم کرنے کیلئے یہ اقدام کیا ہے۔ اگر آپ ایوب خان، یحیٰی خان اور ضیاء الحق کی تقاریر کا مطالعہ کریں تو آپ کو یہ مشترکہ عنصر بغیر کسی مشکل کے معلوم ہو جائے گا۔ درحقیقت ایک ہی قسم کی ڈوری ان ''سادہ سپاہیوں'' کی وردی میں ہوتی ہے۔ جن کی تمنائیں منفی نوعیت کی ہوتی ہیں اور ان کا تعلق ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے دوسرے علاقوں سے ہوتا ہے۔ وہ کسی اعلیٰ نظریہ پر عمل پیرا ہونے کیلئے اقتدار پر غاصبانہ قبضہ نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ کے سمجھوتہ میں ترمیم کرنے کیلئے، تانبے کی کانوں میں غیرملکی مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کیلئے، اس امر کو یقینی بنانے کیلئے کہ ملک ناٹو یا سینٹو کے معاہدات سے علیحدگی اختیار نہ کر سکے۔ بڑی طاقتوں کے عالمی مفادات کے تحفظ کی خاطر قوم کے علاقائی دعوؤں کو ترک کرنے کیلئے ایسا کرتے ہیں۔ حق خودارادی کے حق کے بجائے وہ جی این پی کی بات کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ آزادی کی تحریکوں کی حمایت کرنے کے بجائے وہ افراط زر کی شرح میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور یہ محسوس ہی نہیں کرتے کہ خود ان کا عملہ افراط زر میں اضافہ کا سب سے بڑا سبب ہے۔ وہ تضادات کے خالق

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

ہیں۔ وہ جب سیاسی منظر سے علیحدہ ہوتے ہیں تو وہ اپنے پیچھے کہیں زیادہ بدعنوانی اور رشوت ستانی، زیادہ عدم استحکام، زیادہ بُعد اور اختلاف رائے، زیادہ کمزور اقتصادیات، زیادہ انتشار اور آئینی خلاؤں کے باعث پیدا کردہ گنجلک چھوڑ جاتے ہیں۔

اب تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ اٹلی کے ریڈ بریگیڈز کیوں فوج کو مشتعل کر رہے ہیں کہ وہ اٹلی کی ریاست پر قبضہ کر لے اس لئے کہ وہ ریاست کو تباہ کرنے کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ بات اٹلی کی مثال سے ظاہر ہے اس لئے کہ اٹلی تو مغربی تہذیب کی ماں ہے اور کوئی دکھاوے کی جمہوریت نہیں ہے۔ اٹلی جیسے انتہائی ترقی یافتہ ملک میں ترقی پذیر ممالک کے مقابلہ میں اس قسم کے بنیادی مسائل کو فوری طور پر سمجھ لیا جاتا ہے اس لئے کہ ترقی پذیر ممالک میں عمیق سیاسی مسائل کو عوام کی کھلی آنکھ آسانی سے نہیں دیکھ سکتی ہے چونکہ عوام غربت کے ہاتھوں تنگ آ چکے ہوتے ہیں۔ فوجی جنتا کے جنرلوں کی مہم جوئی کا ایک متعلقہ عنصر ''بدعنوان اور گندے سیاستدانوں'' کا مذاق اڑانا۔ ان کی اہمیت کو کم کرنا اور ان کی تذلیل کرنا ہوتا ہے۔ بغیر کسی پس و پیش کے فوجی جنتا تمام قومی خرابیوں کی ذمہ داری سیاسی قیادت کے کندھوں پر ڈال دیتی ہے۔ ماضی کے واقعات کے بارے میں مبالغہ آمیز اور غلط توضیحات کی جاتی ہیں اور ماضی کی سیاسی قیادت کو بدنام کرنے کی غرض سے جعلی دستاویزات تیار کی جاتی ہیں۔ اقتدار پر غاصبانہ طور پر قبضہ جمانے کے ساتھ ساتھ سیاسی لیڈروں کے کارناموں کو بھی غضب کر لیا جاتا ہے جو سیاسی لیڈر جس قدر زیادہ مقبول ہوتا ہے اور قوم کے واسطے جس قدر زیادہ اس کے کارنامے ہوتے ہیں اتنا ہی زیادہ زور شور کے ساتھ اس کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اور اس کے اوپر ظلم وستم ڈھایا جاتا ہے۔

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

سیدھا سادھا فوجی سپاہی تو بس اس بات پر یقین کرنا ہے کہ ریاست کے مسائل بالکل سادہ نوعیت کے ہیں اور یہ کہ تکڑے قسم کے سیاستدانوں نے انہیں عمداً پیچیدہ بنا دیا ہے تا کہ وہ اپنے غیر فطری سیاسی عزائم کی تسکین کر سکیں۔ اس صورت حال پر یقین کرتے ہوئے سادہ طبیعت فوجی سپاہی پیچیدہ بیرونی مسائل کو حل کرنے کیلئے نامناسب عجلت سے کام لیتا ہے۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ خیر سگالی کے جذبہ کے ساتھ اور فریق ثانی کی پیٹھ ٹھونک کر مسئلے کی سنگینی کو کم سے کم کیا جا سکتا ہے اور اسے ایک ہی لمحہ یا انتہائی مختصر سے وقت میں حل کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ سیاستدان نے مسئلہ کو غیر ضروری طور پر الجھا دیا ہے اور یہ کہ فوجی سپاہی اس معاملہ میں کامیاب ہو سکتا ہے جس میں پیشہ ور سیاستدان ناکام رہا ہے۔ اسی جذبہ اور مقصد کے تحت ایوب خان، یحییٰ خان اور اب ضیاء الحق نے جموں و کشمیر کے تنازعہ سے کھلے دل کے ساتھ سیدھے سادے فوجی سپاہیوں کی طرح نمٹنے کی کوشش کی۔ لیکن طنزیہ صورت حال یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے یکے بعد دیگرے اس معاملے کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیا۔ ان میں سے کوئی بھی سیاستدانوں کو بدنام کرنے اور لافانی شہرت حاصل کرنے کے دوہرے مقصد میں ایک سیدھے سادے سپاہی کی حیثیت سے تنازعہ کو منصفانہ طور پر حل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان حماقتوں کے نتیجہ میں عوام کو اور زیادہ مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

جب بھارتی وزیر خارجہ جنوری ۱۹۷۸ء میں اسلام آباد آئے تو یہ کہا گیا ہے کہ جنرل ضیاء الحق نے اس خیال کا اظہار کیا کہ کشمیر کے معاملہ میں ''کچھ دو کچھ لو'' کا معاملہ کرنا پڑے گا۔ اگر حق خود ارادی کے تسلیم شدہ بین الاقوامی اصول کو ترک کر دیا جاتا ہے تو بہت کم اقوام ایک کہیں زیادہ بڑی ریاست کے مقابلہ میں ایک چھوٹی

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

ریاست کی حمایت کریں گی جبکہ تنازعہ ایک اخلاقی اصول سے ،گر کر ایک لاش رہ جائے جس کو قصاب کی دکان میں کاٹا جائے۔اس صورت حال میں دینا ہی ہوگا کچھ لینا نہیں ہوگا۔اس لئے کہ شیر کو شیر کا حصہ ملے گا یعنی بڑے ملک کو بڑا حصہ ملے گا۔ ۱۹۵۹ء میں ایوب خان خود ہی پالم ایئر پورٹ پہنچے اور بھارت کو شمال کی جانب سے خطرہ کے پیش نظر مشترکہ دفاع کی تجویز پیش کی۔ بھارت نے ۱۹۶۵ء میں ایوب خان کے ڈنڈا کر کے اس خیر سگالی کے جذبہ کا جواب دیا۔پہلی اسلامی سربراہ کانفرنس میں جو ۱۹۷۰ء میں رباط میں منعقد ہوئی تھی، ایک سکھ یحییٰ خان کی اجازت سے اسلامی لیڈروں کی کانفرنس میں بھارت کی نمائندگی کرنے کی غرض سے داخل ہوا۔ گاندھی نے ہمیشہ یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ ہندوستان جائز طور پر مسلمانوں کی نمائندگی کر سکتا ہے اور اس لئے ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان کی ضرورت نہیں ہے لیکن کسی بھی حالت میں تخیل کی کسی بھی پرواز کے تحت ہندو بھارت مسلمانوں کے کاز کی نمائندگی نہیں کر سکتا۔ یحییٰ خان نے اپنے پیشرو کی پیروی کرتے ہوئے رباط میں پاکستان کے روحانی مؤقف کو ایک دوسرا مکا رسید کیا۔ جب یحییٰ خان کو اسلامی سربراہ کانفرنس میں بھارت کی شرکت کے بارے میں سخت ناموافق اور فطری ردعمل سے آگاہ کیا گیا تو یحییٰ خان خوف کے مارے اپنے سمجھوتہ سے پھر گئے۔لیکن نقصان پہنچ چکا تھا۔بعد کے جارحانہ حب الوطنی پر مبنی بیانات اس نقصان کا ازالہ نہیں کر سکتے تھے۔خصوصاً اس طویل بیان کی روشنی میں جو آغا شاہی نے کانفرنس میں بھارت کی شرکت کے دفاع میں دیا تھا۔باوجود انتھک کوششوں کے جو یحییٰ خان نے ایوب خان کی پیروری میں کیں اور بھارت کو بنیادی سہولتیں فراہم کیں، بھارت نے ۱۹۷۱ء میں یحییٰ خان کے بھی ڈنڈا دے دیا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ضیاءالحق کس سبب

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

سے اپنے غیر ضمیر پیشرووں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور اسی نا کارہ پالیسی پر عمل کر رہے ہیں۔ وہ سخت غلطی کا شکار ہیں اگر وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ جالندھر سے انہیں بانس کے بجائے مٹھائی ملے گی، ڈیسائی نے پہلے ہی بانس کا آرڈر دے دیا ہے۔ وہ احمد آباد میں تیار کیا جا رہا ہے، پہلے دو بانس الہٰ آباد میں بنائے گئے تھے۔ ''وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔''

اگر آزادی، جمہوریت، آئینی حکومت اور انسانی حقوق کی ''آزاد دنیا'' کے لئے دیر پا قیمت ہے تو اس کا جواب یا حل یہی ہے کہ فوجی ڈکٹیٹروں کو مکمل طور پر الگ تھلگ اور سماج سے بالکل علیٰحدہ کر دیا جائے۔ اگر اسپین کے جنرل فرینکو کو جو اسپین کی خانہ جنگی کا فاتح تھا بیس سال سے زائد عرصہ تک الگ تھلگ رکھا جا سکتا تھا تو یہ ان دکھاوے کے ڈکٹیٹروں کو جو نہ تو فرینکو ہیں اور نہ ہی اسپین جیسے ملک کے حکمراں ہیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ ان کی مذمت کی جا سکتی ہے۔ اور انہیں سزا دی جا سکتی ہے۔ صرف اس صورت میں جمہوریت، آئینی حکومت اور انسانی حقوق میں آمرانہ نظام کا مقابلہ کرنے کی قوت پیدا ہوگی۔ یہ یا تو کمیونزم ہے یا آزادی ہے۔ یہ یا تو سویلین حکومت ہے یا فوجی جنتا کی حکومت ہے۔ درمیان کی کوئی شے موجود نہیں ہے اور اگر ہے تو اس کی بنیاد ریت میں دھنس رہی ہے فوجی جنتا کمیونزم کی نقیب ہوا کرتی ہے۔ اس حقیقت کو محسوس نہ کر سکنے کی ناکامی افریقہ، ایشیاء اور لاطینی امریکہ میں گنجلک کا باعث ہے۔ فوجی حکومت قطعی طور پر اور نا قابل تنسیخ حد تک عوام کو جنرلوں اور ان کے مربیوں کے خلاف کر دیتی ہے۔ عوام اور کس طرف رجوع کریں؟ اگر آزادی، جمہوریت اور انسانی حقوق کو یہ دیکھنے کیلئے کاؤنٹر پر رکھا جائے کہ آیا تانبے اور چائے کی قیمت دس سینٹ زیادہ ہے یا کم ہے اور اتنی سی بات پر ان کا سودا کیا

Copyright © www.bhutto.org

جائے تو آزادی تو ایک نہایت سستی سی جنس ہے اور انسانی حقوق کی قیمت تو پھر ایک نکل کے برابر بھی نہیں ہے۔

جب سرد جنگ عروج پر تھی اور مغربی طاقتوں کی کمیونسٹ طاقتوں کے ساتھ زبردست محاذ آرائی تھی تو یہ بات قابل فہم تھی کہ مغرب نہ صرف روس اور کمیونسٹ چین کے خلاف تھا بلکہ وہ ان غیر کمیونسٹ ممالک کے بھی خلاف تھا جو کمیونسٹ ممالک کے دوست تھے یا ان سے ہمدردی رکھتے تھے۔ ان ممالک کو ''سفر کے ساتھی'' سمجھا جاتا ہے لیکن دیتانت کے بعد۔ صدر نکسن کے چین کے دورہ کے بعد اور ہیلنسکی سمجھوتہ کے بعد جبکہ مغرب روس کے ساتھ سالٹ دوئم معاہدہ کرنے کا خواہشمند ہے اور چین کو اسلحہ فروخت کر رہا ہے صورت حال بہتر طور پر تبدیل ہو جانی چاہئے اور دوسرے ممالک کیلئے نمایاں طور پر تبدیل ہو جانی چاہئے۔ دیتانت اور شنگھائی کے اعلامیہ کے بعد تو ہر ملک مختلف حوالہ سے سفر کا ساتھی ہے۔ مغرب کمیونسٹ ممالک کے ساتھ معمول کے مطابق اور دوستانہ تعلقات چاہتا ہے۔ یہ بات نہ صرف روس اور چین کیلئے درست ہے بلکہ یوگوسلاویہ، رومانیہ، پولینڈ اور دوسرے مشرقی یورپی کمیونسٹ ممالک کیلئے بھی صحیح ہے۔ اس کے ساتھ ہی مغرب ان غیر کمیونسٹ ممالک کے ساتھ خوش نہیں ہے جن کو مغرب روس یا چین کے حامی خیال کرتا ہے۔ اس کا تو یہ مطلب ہے کہ روس کے صدر برزنیف یا چین کی کمیونسٹ پارٹی کے چیئرمین ہیوکیو ینگ کو غیر کمیونسٹ نیشنلسٹ مسلم لیبیا کے قذافی اور مسلم الجیریا کے غیر کمیونسٹ نیشنلسٹ بومدین پر ترجیح دی جائے گی۔ یہ بات بتانے کے بعد اب میں آگے نہیں جاؤں گا۔ نتیجہ یہ ہے کہ مغرب کی رائے میں کسی کمیونسٹ ملک کا لیڈر ہونا کسی غیر کمیونسٹ ملک کے غیر کمیونسٹ لیڈر کے مقابلہ میں قابل ترجیح ہے جس کے دوستانہ

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

تعلقات کسی کمیونسٹ ملک سے ہوں۔تشبیہہ یہیں ختم نہیں ہو جاتی ہے۔مغرب کا حامی ہونا اور بھی خطرناک ہے اگر قومی کاز کے دفاع میں وہ لیڈر اختلاف رائے کرتا ہے تو اس سویلین لیڈر کو فوجی انقلاب کے ذریعہ اقتدار سے محروم کر دیا جاتا ہے۔اس کی جگہ ایک فوجی ڈکٹیٹر سنبھال لیتا ہے جس کو کسی معاملہ میں اختلاف رائے کرنے کی جرأت ہی نہیں ہوتی ہے۔جن میں ملک کے اہم قومی مفادات شامل ہیں۔اس تشبیہہ کا اطلاق اور مزید ہوتا ہے۔اس قسم کے ضمانت شدہ پٹھوکی عوام اور قوم کے خلاف پالیسیاں ملک میں کمیونزم کو اس سے زائد پھیلاتی ہیں جس قدر کہ کسی سویلین قومی لیڈر کا عدم اتفاق رائے کہیں کہیں کمیونزم کے پھیلنے کا باعث ہوتا ہے۔

اس جنون کا بھی ایک طریقہ کار ہے۔ایک کمیونسٹ ملک کے ایک کمیونسٹ لیڈر کو ایک غیر کمیونسٹ ملک کے ایک غیر کمیونسٹ لیڈر پر ترجیح دی جاتی ہے جس کو ایک مغرب نواز اور خود ہی تبدیل ہو جانے والے ایک سویلین لیڈر پر ترجیح دی جاتی ہے۔اس قسم کی مشکل صورت حال کو فوجی جنتا خطرہ میں ڈال دیتی ہے جس کو مغرب نے فروغ دیا ہو۔فوجی جنتا کی پالیسیاں کمیونسٹ انقلاب کی راہ ہموار کرتی ہیں۔اس چکر کے ذریعہ مغربی ممالک قیادت سے معاملہ کرتے ہیں اور اس قسم کے ملک سے معاملہ کرتے ہیں جو مغرب کے نزدیک سب سے زیادہ قابل ترجیح ہوتا ہے۔یہ گورکھ دھندا دیتانت اور شنگھائی اعلامیہ کی منطق کی وضاحت کرتا ہے۔یہی ہیلنسکی کا جذبہ ہے اور بریزینسکی نے اپنے پیکنگ کے دورہ میں جو کمیونسٹ چین اور اس کے لیڈر کی تعریف کی ہے اس کا مقصد و منشاء بھی یہی ہے۔

چونکہ ایوب خان ایک عملی آدمی تھے اور ہونے والے واقعہ سے ان کو تکلیف ہوئی تھی۔اس لئے انہوں نے سادہ سے الفاظ میں پاکستان میں ہونے والی گفتگو

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

کے دوران صدر نکسن کے سامنے صورت حال کو رکھا۔ صدر نکسن نے اس گفتگو کو اپنی یادداشتوں میں صفحہ ۲۵۶ پر اس طرح ریکارڈ کیا ہے کہ "پاکستان میں مَیں نے اپنے پرانے دوست صدر ایوب خان سے ملاقات کی۔ انہوں نے یکم نومبر ۱۹۶۳ء کو ویتنام کے صدر نگو ڈنگھ ڈائم کے قتل پر جو کینیڈی کے قتل سے تین ہفتے پہلے ہوا تھا اور جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اس میں امریکہ کی سازش تھی افسوس کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ 'میں شاید کہہ نہیں سکتا کہ اول تو آپ کو ڈائم کی حمایت نہیں کرنی چاہئے تھی۔ لیکن آپ نے عرصہ تک اس کی حمایت کی اور ایشیا میں ہر شخص کو اس بات کا علم تھا۔ خواہ وہ اس صورت حال کو پسند کرتے تھے یا نہیں کرتے تھے وہ اس حقیقت کو جانتے تھے اور پھر یکا یک آپ نے اس کی مدد کرنا چھوڑ دی اور ڈائم قتل کر دیا گیا' انہوں نے اپنے سر کو ہلایا اور پھر کہا کہ "ڈائم کا قتل بہت سے ایشیائی لیڈروں کیلئے تین معنی رکھتا ہے کہ امریکہ کا دوست ہونا خطرناک ہے۔ یہ کہ غیر جانبدار رہنے میں فائدہ ہے اور یہ کہ بسا اوقات امریکہ کا دشمن ہونا بھی مددگار ہوتا ہے۔"

ایوب خان نے اپنے خصوصی انداز میں ایک عام اصول کو ذاتی حیثیت دے دی تھی جس کو میں نے مغربی حکمت عملی کی توضیح کیلئے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب نام نہاد آہنی پردہ موجود تھا تو مغرب کے لئے ایک منطقی بات تھی کہ وہ اس پردہ آہنی کے پیچھے کمیونسٹ ممالک کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرے اور ان کے خلاف بھی مخالفانہ رویہ اختیار کرے جو اس پردہ آہنی کو باہر سے مستحکم کرتے تھے یا مستحکم کرتے ہوئے نظر آتے تھے لیکن جب دیتانت کے باعث آہنی پردہ اٹھ گیا اور مغربی لیڈر کریملن میں وودکا اور کیویر کے ساتھ روسی لیڈروں کے جام صحت پینے لگے اور بعد میں وہ ایسا ماؤزے تنگ اور چینی لیڈروں کے جام صحت بھی عوام کے عظیم

 Copyright © www.bhutto.org

ہال میں پینے لگے تو پھر کمیونسٹ ممالک کے غیر کمیونسٹ لیڈروں کے ساتھ ان کی مغائرت اور عناد بالکل غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ غیر مناسب اور غیر منطقی ان غیر جانبدار اور مغرب نواز سیاسی لیڈروں کے بارے میں مغرب کی ناراضگی کا اظہار ہے جو اپنے قومی مفادات کے تحفظ کیلئے اس سے اختلاف رائے کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ میں ایک اور قدم آگے جانے کی جرأت کروں گا اور کہوں گا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا امریکہ کے وفاقی جمہوریہ جرمنی اور جاپان کے ساتھ تعلقات میں اس سے زیادہ کھچاؤ اور تناؤ ہے جس قدر کھچاؤ اور تناؤ اُس کے تعلقات میں کمیونسٹ پولینڈ یا کمیونسٹ رومانیہ کے ساتھ ہے۔ عالمی مساوات درحقیقت الٹی ہے۔

اس اندوہناک شکایت کو تاریخ کی منطقی توضیح کی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ ۱۸۴۴ء میں کارل مارکس نے کہا تھا کہ ''سرمایہ دارانہ نظام خود ہی اپنی بربادی کے بیج بوتا ہے۔'' اس صورت حال کو بیان کرنے کا یہ ایک اختصار والا طریقہ ہے۔ مارکس اس امر کا حوالہ دے رہا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام اپنے آپ کو خود ہی تباہ کر رہا ہے اس لئے کہ سرمایہ دار ممالک دنیا کے خام مال کے واسطے آپس میں جنگیں لڑتے ہیں چونکہ سرمایہ دارانہ نظام نے بظاہر تباہی کے اس طریقہ پر غلبہ حاصل کرلیا ہے اس لئے اس نے ڈپلومیسی کے ذریعہ اپنی تباہی کا دوسرا طریقہ اپنا لیا ہے۔

اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔ مثال کے طور پر ناصر اور سوئیکارنو کمیونسٹ لیڈر نہیں تھے اور وہ مغربی طاقتوں کے پٹھو اور چمچے بھی نہیں تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ امریکہ کے دوسرے صدور کے مقابلہ میں صدر آئزن ہاور نے ناصر کی پوزیشن کے بنیادی فرق کو سمجھا تھا۔ تم کہہ سکتی ہو کہ میں آئزن ہاور جیسے فوجی لیڈر کی سیاسی بصیرت

اور دانشمندی کا اعتراف کر کے خود اپنے مؤقف کی تردید کر رہا ہوں۔ ایسا بالکل نہیں ہے۔ فوجی لیڈر تو بے شمار ہیں۔ میں نے اس سے پہلے بھی ان کے درمیان امتیازی خط کھینچا ہے۔ جنرل چارلس ڈیگال بھی ایک اعلیٰ پایہ کے فوجی لیڈر تھے اور ایک سربرآوردہ سیاسی لیڈر تھے۔ ایسے لیڈر واقعی لیڈر ہوتے ہیں۔ وہ دوسری جنگ عظیم کے جہنم سے ہو کر گزرے تھے اور وہ ڈپلومیسی سیاست سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ جنرل ڈیگال اور جنرل آئزن ہاور دونوں ہی کو عوام نے ووٹوں کے ذریعہ منتخب کیا تھا اور دو مستحکم جمہوری ممالک کے صدر منتخب کئے گئے تھے انہوں نے اقتدار پر قبضہ پیچھے کے دروازے سے آ کر نہیں کیا تھا اور نہ ہی کوئی فوجی انقلاب برپا کر کے ایسا کیا تھا۔ ایسے مشہور معروف فوجی اور سیاسی لیڈروں کا موازنہ غیر انقلابی، غیر نظریاتی اور جی این پی کے دلدادہ غاصبوں سے کرنا درحقیقت اول الذکر کی توہین ہے۔

دو اور مثالیں انتہائی موزوں ہیں۔ پاکستان کو ۱۹۶۵ء میں سزا دی گئی۔ اسلحہ کی سپلائی پر پابندی عائد کر دی گئی حالانکہ پاکستان سیٹو اور سینٹو کا ممبر تھا اور بہت سے اقدامات میں وہ امریکہ کا شریک کار تھا۔ پاکستان جو ایک وفادار اتحادی اور نہرو کے الفاظ میں سب سے زیادہ وابستہ اتحادی تھا اس کو چین کی پالیسی کے باعث سزا دی گئی۔ پانچ سال بعد ایک امریکی صدر پاکستان کو واشنگٹن اور پیکنگ کے درمیان ایک پل کے طور پر استعمال کر رہا تھا کہ وہ اس پل کو پار کر کے پیکنگ پہنچ جائے۔ وزیر اعظم چو این لائی نے بلا مقصد یہ بات امریکی صدر سے نہیں کہی تھی کہ وہ اس پل کو نہ بھولیں جس کو پار کر کے وہ پیکنگ پہنچے ہیں۔ دوسری مثال برازیل کی ہے۔ صدر گولرٹ مویشیوں کے ایک بڑے باڑے کے مالک تھے اور بہت دولت مند آدمی تھے ان کی خوبصورت بیوی ایک ملکہ کی طرح لباس پہنتی تھی۔ گولرٹ خواہ کچھ بھی رہا

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

ہو، ہوسکتا ہے کہ ان کے بہت سے روپ رہے ہوں لیکن وہ کمیونسٹ نہیں تھے بالکل اسی طرح جس طرح ایوب خان کمیونسٹ نہیں تھے لیکن ایک نا قابل معافی گناہ جو صدر گولرٹ سے سرزد ہوا تھا وہ یہ تھا کہ انہوں نے ۱۹۶۳ء یا ۱۹۶۴ء میں عوامی جمہوریہ چین کو تسلیم کرلیا تھا۔ چین کے ایک تجارتی مشن نے برازیل کا دورہ کیا تھا اور چند مہینوں کے بعد ہی برازیل میں فوجی انقلاب برپا ہوا جس نے صدر گولرٹ کو برطرف کردیا۔ ان کے برطرف کئے جانے کے وہی اسباب بیان کئے گئے کہ ملک میں افراط زر ہے اور اقتصادی بدانتظامی ہے۔ برازیل تقریباً ۱۵ سال سے فوجی ڈکٹیٹر کے تحت ہے۔ اس قدر طویل عرصہ تو انسانوں کو انسانی صفات سے محروم کرنے کیلئے کافی ہے۔ اس طرح سے برازیل کے فوجی جنتا نے دہشت گردی کو کنٹرول کیا ہے۔ اب بریزینسکی کس طرح اپنی تقریروں کا موازنہ جو انہوں نے مئی ۱۹۷۸ء میں چین کی تعریف میں کیں، ان تقریروں سے کریں گے جو صدر گولرٹ نے ۱۹۶۳ء یا ۱۹۶۴ء میں برازیل میں چین کی تعریف میں کی تھیں۔ اگر اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب وقت وقت کی بات ہے تو دوستوں اور اتحادیوں کو اس لئے تو سزا نہیں دینی چاہئے کہ وہ بہتر طور پر صحیح وقت کی حس رکھتے ہیں۔

مغربی تہذیب عیسائی تہذیب ہے۔ اس عظیم اور شاندار تہذیب کی جڑیں حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات میں پیوست ہیں، عیسائیوں کے کہنے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ نہ صرف ایک نبی تھے بلکہ وہ ''اللہ کے بیٹے'' بھی تھے۔ ہم مسلمان انہیں ایک نبی کی حیثیت سے مانتے ہیں اور ان کی پاک اور مقدس پیدائش پر بھی یقین رکھتے ہیں لیکن اسلام سختی سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر یقین رکھنے والا مذہب ہے۔ وہ ''والد'' ''بیٹے اور''روح القدس'' کے تصور کو قبول نہیں کرتا ہے۔

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

عیسائیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰ کی تعلیمات و ہدایات اللہ کے ایک نبی کی تعلیمات و ہدایات کے مقابلہ میں زیادہ مقدس ہیں۔ عیسائیوں کے کہنے کے مطابق وہ ہدایات وتعلیمات خود اللہ تعالیٰ کی ہدایات وتعلیمات ہیں۔ تیسری دنیا کے زیادہ تر مسائل حل ہو جائیں گے اگر عیسائی مغرب لفظاً اور معناً حضرت عیسیٰ کی صرف ایک ہی ہدایت پر عمل کرے۔ وہ ہدایت یہ ہے کہ ''جس بات کا تعلق سیزر سے ہے اس کا حق سیزر کو ادا کرو اور جس بات کا تعلق اللہ سے ہے اس کا حق اللہ کو ادا کرو'' تیسری دنیا صرف وہی چاہتی ہے جو اس کا حق ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی۔ دو سو سال سے زائد عرصہ تک مغرب کی عیسائی تہذیب بڑی بے رحمی کے ساتھ حضرت عیسیٰ کی اس ہدایت سے انحراف کر رہی ہے۔ مغرب ہر وہ شے جس کا تعلق سیزر سے ہے لے رہا ہے۔ اور وہ ہر وہ شے بھی لے رہا ہے جس کا تعلق اللہ سے ہے۔ مغرب اس حصہ کو منصفانہ طور پر تقسیم نہیں کر رہا ہے۔ وہ ہمیں وہ شے نہیں دے رہا ہے جس پر ہمارا حق ہے۔ اس تقسیم کا تعلق تیسری دنیا کے اقتصادی، سماجی، نسلی اور سیاسی حقوق سے ہے۔ اس کا مطلب افریقہ میں بغیر کسی تاخیر کے اکثریت کی حکومت ہے۔ اس کا مطلب نسلی امتیاز کے خاتمہ اور کسی نسل کو الگ تھلگ کر دینے کے خاتمہ سے ہے۔ اس کا مطلب مواقع کی عدم مساوات کے خاتمہ سے ہے۔ اس کا مطلب انسانی عظمت کے احترام سے ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس کا مطلب باعزت اور انصاف پر مبنی زندگی ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی کو نقصان یا تکلیف پہنچائے بغیر ہی انتظامات کئے جا سکتے ہیں۔ ہم اپنی روزمرہ کی روٹی چاہتے ہیں۔ ہم اس بات پر اصرار نہیں کرتے کہ روٹی پر مکھن یا کریم ضرور لگایا جائے۔ ہم اس مادی خوشحالی کی سطح پر نہیں پہنچے ہیں کہ طمع میں مست رہیں اور مطلب پرستی میں فخر محسوس کریں۔ ہم اس

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

سے زائد نہیں چاہتے جو ہمارے قریبی پڑوسی کو حاصل ہے۔ ورنہ اچھا پڑوسی ہونا ہمارے لئے ممکن نہیں ہوگا۔ ہم مشرق ومغرب اور دونوں دنیاؤں کی دوستی چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تیسری دنیا میں ہیں اور یہ وہ دنیا ہے جو دو دنیاؤں کے درمیان ایک پل ہوسکتی ہے۔

ہم فاصلہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم مغرب کو تنگ اور پریشان نہیں کریں گے۔ ہمارا پل وہ بوسہ نہیں ہوگا جو جنرل موبوتو سیسے سیکو نے صدر ویلری کسکارڈ ڈی ایئنگ کا لیا تھا جب وہ افریقہ کے بارے میں ورسلیز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے جنگ سے تنگ آ کر پیرس میں آ کر اترے تھے اور نہ ہی ہمارا پل جنرل ضیاء الحق کی طرح برطانیہ کے حیران وزیراعظم کو سینہ سے لگانا ہوگا جب وہ جنوری ۱۹۷۸ء میں لاہور سے اسوان کیلئے روانہ ہو رہے تھے۔ برادرانہ اخوت اور بے تکلفی قدرے مادی مساوات کے حصول سے نہ کہ ''آقا۔ ملازم'' کے تعلق سے پیدا ہوتی ہے جس کے باعث شدید اقتصادی ناہمواری اور عدم مساوات پیدا ہوتی ہے۔ ۱۹۵۴ء میں ہند چین کے بارے میں جنیوا کانفرنس میں جان فاسٹر ڈلیس نے وزیراعظم چواین لائی سے مصافحہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وزیراعظم جواہر لال نہرو کی نئی دہلی میں آخری رسومات کی ادائیگی کے موقع پر خوبصورت لارڈ لوئیس ماؤنٹ بیٹن ایک ایڈمرل کی شاندار وردی میں میری نشست سے صرف تین نشستوں کے فاصلہ پر بیٹھے تھے۔ میں نے برطانوی لارڈ کے ساتھ جو غیر منقسم ہندوستان کے آخری وائسرئے تھے ہاتھ ملانے سے گریز کیا، کچھ تو اس لئے کہ میرے خیال میں انہوں نے پاکستان کو نقصان پہنچایا تھا اور کچھ اس ہتک کا بدلہ لینے کیلئے جو ڈلیس نے ایشیاء کے ایک عظیم لیڈر کی کی تھی۔ احترام اور ستائش کے ذریعہ ہمارا پل ہماری دوستی کا ہاتھ ہوگا۔ اگر مغرب

احترام وستائش کا جواب احترام وستائش سے دیتا ہے تو ہماری دوستی مضبوط اور گرم جوشی سے عبارت ہوگی۔

ہم مغرب کوخوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ہمیں اس کی کمزوریاں اور خوبیوں کا علم ہے۔ مغرب جس نے صدیوں تک تیسری دنیا پر اپنا غلبہ قائم رکھا ہے ہمارے بے چین موڈ اور حساس جذبات کو سمجھنے میں یا تو ناکام رہا ہے اور یا وہ اپنے ردعمل کا اظہار نہیں کرتا ہے۔ جب روس کے وزیراعظم اقوام متحدہ میں اپنے جوتے اتار دیتے ہیں اور انہیں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو دکھاتے ہیں تو سیکرٹری جنرل اس پر مسکراتے ہیں۔ بلند پلیٹ فارم سے نیچے اتر کر جاتے ہیں اور روس کے وزیراعظم کے پاس جا کر ان سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ میں روس کے وزیراعظم سے صرف تین قطار آگے بیٹھا ہوا تھا جب ایسا ۱۹۶۰ء کے موسم خزاں میں ہوا تھا لیکن جب ہم اپنے ملک کے جائز حقوق کے تحفظ کی کوشش کرتے ہیں یا اسے بین الاقوامی برادری کا ایک زیادہ کارآمد ممبر بنانا چاہتے ہیں تو ہماری کوششوں کو غلط سمجھا جاتا ہے۔ فوجی انقلاب لانے کی سازش کی جاتی ہے اور اس قسم کے فوجی انقلاب کی کامیابی کے بعد اس قسم کا بیان دیا جاتا ہے کہ ''وہ تو اپنی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر بات کر رہا تھا۔'' میں اپنے ملک کے جوتے کسی کے چہرے کے سامنے تو نہیں لہراتا ہوں لیکن پھر بھی اقتدار کا نشہ اس قسم کی قابل افسوس باتیں کہنے کی ترغیب دیتا ہے۔

براہ کرم یہ خیال نہ کریں کہ فوجی جنتا نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس کی وجہ سے میں نے بہت زیادہ سختی کے ساتھ اپنی رائے قائم کی ہے۔ مجھے تاریخ کی کافی معلومات ہیں اور میں جانتا ہوں کہ پانسہ پلٹ جاتا ہے اور کل کے شہنشاہ آج کے فقیر بن جاتے ہیں۔ تمہیں علم ہے کہ میں نپولین بونا پارٹ کا مداح ہوں۔ تمہیں

معلوم ہے کہ فرانسیسی انقلاب اور نپولین کے دور کے ساتھ میری جذباتی وابستگی کس قدر ہے۔ انقلابیوں نے نہ صرف اپنے بادشاہ کو قتل کیا بلکہ وہ اپنے ہی لائے ہوئے انقلاب میں غرق ہو گئے۔ روبسپیئر اور ڈینٹن کو پھانسی کے تختہ پر چڑھنا پڑا اور وہ دونوں ممتاز انقلابی تھے۔ انتقام پر انتقام لیا گیا۔ نپولین جو ایک غیر معمولی صلاحیتوں کا انسان تھا اور تہذیب کے قافلہ کا مکمل کپتان تھا اس کو ایلبا اور سینٹ ہیلینا میں مقید کر دیا گیا۔ نپولین کو کس نے ایلبا اور سینٹ ہیلینا جلاوطن کیا؟ فرانس کے عوام نے تو ایسا نہیں کیا۔ فرانس کا انقلاب دو صدیوں پہلے آیا لیکن انتقام اور جوابی انتقام کی وجہ سے وہ اپنے بنیادی مقصد سے محروم ہو گیا۔ جب فرانس کا انقلاب منتقم المزاج ہو گیا اور ذاتیات پر اتر آیا تو فرانس کے عوام (جن کو انقلاب سے بہت زیادہ توقعات تھیں) کا انقلاب پر یقین اور انقلابیوں پر اعتماد ختم ہو گیا۔ فرانس انقلاب کی ماں ہے۔ اس نے انقلاب کے بچہ کو جنم دیا۔ اس وقت سے فرانس کے عوام نے اکثر اوقات فرانس کو انقلاب کے نطفہ سے حاملہ کیا لیکن پیدائش سے پہلے ہی اسقاط حمل کرا دیا۔ ہمیں زیادہ دور ماضی میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فرانس میں انقلاب کا اسقاط حمل مئی ۱۹۵۸ء، مئی ۱۹۶۸ء اور مارچ ۱۹۷۸ء میں کیا گیا۔ اس کی جزوی طور پر توجیح تو اس تجربہ سے ہوتی ہے جو ۲۰۰ سال پہلے فرانس کو انقلاب کے بچہ سے حاصل ہوا تھا۔ اس بچہ نے اسی قدر تخلیق کیا جس قدر کہ تباہ کیا۔ تضاد یہ ہے کہ اسے پرانے نظام کو ختم کرنا اور نئے نظام کی تعمیر کرنا تھا۔ انقلاب کے مخالفین نے اس تضاد کو غلط رخ دے دیا۔ انقلابی لیڈر ''آزادی، مساوات اور برادرانہ مفاہمت'' کے اعلیٰ وارفع اصولوں کو سنجیدہ نوعیت کے اداروں میں مستحکم کرنے میں ناکام رہے۔ خون خرابہ انقلاب کا عنوان بن گیا۔ انقلاب نے شرفاء کو ختم کر دیا لیکن شرفاء پھر پیدا

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

ہو گئے ۔ انقلاب نے بادشاہ اور ملکہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا لیکن بادشاہ اور ملکہ فرانس کے تخت پر جلوہ افروز ہو گئے ۔

زار اور اس کے خاندان والوں کو ہلاک کر دیا گیا لیکن روسی انقلاب کو اس اقدام کی بنیاد پر تعمیر اور مستحکم نہیں کیا گیا ہے۔ زار کا قتل روسی اقتدار کی تعمیر سے اس قدر تعلق نہیں رکھتا تھا جس قدر کہ چیانگ کائی شیک کا فرار چین میں انقلاب کی طاقت کی تعمیر سے متعلق نہیں تھا۔ جب جمال عبدالناصر نے فاروق کی بدعنوان حکومت کا تختہ الٹا تو ان کے بہت سے ساتھیوں کی خواہش تھی کہ فاروق کو قتل کر دیا جائے لیکن ناصر نے انکار کر دیا۔ انہوں نے فاروق کو مصر سے چلے جانے کی اجازت دے دی۔ ناصر کو مہذب دنیا کی نگاہوں میں بلند مقام حاصل ہو گیا۔ انہوں نے بنی نوع انسان کی اعلیٰ تر اقدار کو اپنایا۔ فاروق پورے احترام کے ساتھ مصر سے روانہ ہو گیا۔ ناصر نے اپنے سابق بادشاہ کو سلام کیا، جب شاہی جہاز مصر کے بحری ساحل سے روانہ ہوا۔ ایک اچھے مسلمان کی حیثیت سے ناصر نے اسلامی تاریخ کی روایات کی پیروی کی، ان کے انقلاب کو اس لئے نقصان نہیں پہنچا کہ انہوں نے انقلاب کے ساتھ رحم دلی کا مظاہرہ کیا۔

ترکی میں فوجی جنتا نے یہ خیال کیا کہ ترکی کے مسائل کا ایک آسان اور سادہ طریقہ ادنان میندریز کو تختۂ دار پر لٹکا دینا ہے۔ ستمبر ۱۹۶۰ء میں ایوب خان نے مجھے ترکی بھیجا تھا کہ میں فوجی جنتا سے میندریز کو سزائے موت سے بچانے کی اپیل کروں۔ میں نے جنرل گرسل سے طویل ملاقات کی تھی، ترکی کے وزیر خارجہ سلیم موجود تھے۔ جنرل گرسل نے مجھ سے کہا کہ ترکی کے مسائل میندریز کو سزائے موت پر عمل کرنے سے حل ہو جائیں گے۔ عجیب بات یہ ہے کہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ

اناطولیہ کے کچھ حصوں میں موت کی سزا پر شدید تشدد پر مبنی ردعمل ہوگا لیکن پھر چند مہینوں میں ہر شخص میندریز کو بھول جائے گا۔ میں نے جنرل گرسل سے کہا کہ ترکی کے مسائل میندریز کو پھانسی دے دینے سے حل نہیں ہوں گے بلکہ ترکی کے اصل مسائل کی ابتداء ہی میندریز کی پھانسی سے ہوگی۔ میں نے ان سے کہا کہ ترکی کے عوام اس پھانسی کو چند مہینوں میں نہیں بھلا دیں گے۔ اس کے برعکس ہر ترک نئی نسلوں تک پھانسی کے گناہ کا احساس اپنے ساتھ لئے پھرے گا۔ میں نے جنرل گرسل سے کہا کہ میندریز تو پھانسی پا کر لافانی ہو جائے گا اور اس سانحہ کا گہرا داغ ترکی کے چہرے پر نمودار ہو جائے گا اور اس کی سیاست میں ایک گہری تفریق پیدا ہو جائے گی۔ جب میں جنرل گرسل کے دفتر سے روانہ ہوا تو سلیم سارپر نے اپنا ہاتھ میرے کاندھے پر رکھتے ہوئے کہا کہ ''اللہ تمہارا بھلا کرے۔'' اس سے قبل میری گرما گرم بحث کرنل الپاسلان ترکیز کے ساتھ ہوئی تھی جو اس وقت فوجی جنتا میں ایک کلیدی حیثیت رکھتے تھے۔ ترکی اب بھی اس المناک سانحہ کے اثرات سے متاثر ہے۔ وہ اب تک اس نفسیاتی صدمہ سے نجات حاصل نہیں کرسکا ہے۔

حال ہی میں صدر داؤد اور ان کے خاندان والے افغانستان میں تبدیلی کے عمل کے دوران ہلاک کر دیئے گئے۔ ایسا انقلابی جنگ کے دوران ہوا۔ ایسا وقت کی منطق کے مطابق تھا۔ وہ قتل پہلے سے سوچے سمجھے اور بے رحمانہ طریقہ سے اور عدالتی قتل کے ذریعہ نہیں کیا گیا تھا جس کا کہ میں شکار کیا گیا ہوں۔ کسی لمحہ میں اشتعال کے باعث جو کچھ ہو جاتا ہے اور ایک گندی سازش کے درمیان جو مہینوں تک چلتی رہے بہت زیادہ فرق ہوا کرتا ہے۔ ان میں سے ایک تو ایک زلزلہ یا کوہ آتش فشاں کے پھٹنے کی طرح ہے جبکہ دوسری صورت آہستہ آہستہ زہر دینے کے مترادف ہے یا کسی

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

زنجیر میں جکڑے ہوئے انسان پر سرخ چیونٹیاں چھوڑ دینے کے مترادف ہے۔آخر کاراس ابتدائی زمانہ کے سے انتقام کا کیا مقصد ہے؟اس معاملہ میں یہ رویہ مطلب پرستی اور رجعت پسندی پرمبنی ہے۔ایسا کرنا فوجی جنتا کے فائدہ کی چیز ہے۔نہ کہ ملک کے عوام کیلئے مفید ہے اگر عوام میرا سر چاہتے تو میں بلا پس و پیش اپنا سران کے سامنے جھکا دیتا۔اگر میں عوام کے اعتماد واحترام سے محروم ہوگیا تھا تو میں خود ہی زندہ رہنا پسند نہیں کرتا۔اس ڈرامہ کا المیہ یہ ہے کہ مخالف صورت حال درست ہے۔فوجی جنتا ہر قسم کے مشیر جمع کرتی ہے۔فوجی جنتا کا ذہن کوئی اچھا مشورہ قبول نہیں کرتا ہے ۔دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ کہا گیا تھا کہ انگریز امریکیوں کے نزدیک ویسے ہی ہوں گے جیسے کہ یونانی رومیوں کے نزدیک تھے۔ایسا نہیں ہوااس لئے کہ امریکیوں نے اطالوی لوگوں کی طرح برتاؤ کیا۔فوجی جنتا کے کرتا دھرتا ال کیپو ینز یونانیوں کو نہیں سمجھ سکتے۔

ان وحشیوں نے ''میرے'' ساتھ جو کچھ کیا ہے اس پر اشتعال اور ذاتی غصہ کا ہونا لازمی ہے۔''میرے'' سے میری مراد ہم سب ہیں یعنی ہمارے دوست اور پارٹی کے وفادار ہیں۔اس کے علاوہ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے قومی مفادات کواور زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔بلاشبہ ذاتی تلخی ہے لیکن غیر ذاتی تکلیف کا احساس ذاتی جذبات پر غالب ہے۔یہ افراد پاکستان کو ۱۹۴۷ء کے دور میں واپس لے گئے ہیں۔اس عمل میں انہوں نے قوم کو ان اعلیٰ و ارفع نظریات اور اخوت کے جذبہ سے محروم کر دیا ہے۔جس کا مظاہرہ عوام نے ۱۹۴۷ء میں کیا تھا اور جوان کے اندر اس وقت موجود تھا۔یہ صورت حال یہ کہنے سے بھی خراب تر ہے کہ ہم الٹے پاؤں لوٹ آئے ہیں یا یہ کہ ہم اس جگہ پھر واپس آ گئے ہیں جہاں سے ہم نے سفر کا آغاز کیا تھا۔قومیں الٹے

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

پاؤں واپس نہیں آیا کرتی ہیں۔قومیں یا تو ترقی کرتی ہیں یا پھر دھماکہ کے ساتھ انحطاط کا شکار ہو جاتی ہیں اور یا خاموشی کے ساتھ روبہ زوال ہو جاتی ہیں۔

تم اپنی عمر کے موسم بہار میں ہو لیکن تاریک و مایوس کن سردی کے موسم کی دنیا میں رہ رہی ہو۔ ہر جگہ نا مساعد حالات کی پیشگوئی کا احساس ہے۔ یہ ایک گڑ بڑ والی اور فتنہ انگیز دنیا ہے۔عدم اطمینان اور مایوسی کی کیفیت طاری ہے۔ کچھ علاقوں میں دوسرے علاقوں کے مقابلے میں صورت حال زیادہ خراب ہے۔ کچھ مما لک میں تو بحران کا تدارک کیا جا سکتا ہے لیکن کچھ مما لک میں بحران نے اس قدر پیشرفت کر لی ہے کہ وہ تدارک کے مقام سے گزر گیا ہے۔ انسانیت بدترین بحران سے دوچار ہے۔ یہ وہ شدید اور نازک صورت حال ہے جس نے ینگ سیاؤ پنگ کو ۹ جون ۱۹۷۸ء کو دنیا کو خبردار کرنے کیلئے مجبور کیا کہ وہ اس حقیقت کا احساس کرے کہ تیسری جنگ عظیم شروع ہونے والی ہے۔

میں نے مسئلے کے حل سے پہلے باعزت مفاہمت کی ضرورت کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ خطرناک صورت حال سے بچنے کی آخری کوشش ہے۔ میں زیادہ پر امید نہیں ہوں۔ میں تباہی کو آتا دیکھ رہا ہوں جو ناگزیر معلوم ہوتی ہے۔اپنے بچوں کی خاطر اور ساری دنیا کے بچوں کی خاطر میں مسئلے کے آخری حل سے پہلے مفاہمت کا خواہاں ہوں لیکن اگر میں اپنے پوتے پوتیوں کے بارے میں سوچتا (یعنی میرے وہ پوتے پوتیاں جو ساری دنیا میں ہیں) تو میں کہتا کہ تباہی آنے دو۔ جو لوگ اس عالمی تباہی سے معجزانہ طور پر بچ جائیں گے ان کو از سر نو نئی دنیا تعمیر کرنے کا شاندار موقع حاصل ہوگا۔ساری ٹوٹی پھوٹی دنیا ان کے قدموں پر ہوگی۔ وہ ایک نئے عالمی نظام کے وضع کرنے والے ہوں گے۔ وہ بغیر کسی حد بندی کے قوم کی تقدیر کے محافظ

Copyright © www.bhutto.org

ہوں گے۔ وہ راکھ اٹھائیں گے اور زیادہ نئے اور بہتر خطوط کی تعمیر کریں گے۔ ان میں سے ہر کوئی ایک بہتر فرینک لائیڈ رائٹ اور لے کوربزیر ہوگا۔ شاید ریکارڈو بوفل جیسا غیر معمولی ذہین شخص اس قتل عام سے بچ جائے اور مائیکل اینجیلو یا گاڈی کی عظمت و بلندی تک اپنے عزم وحوصلہ کے مطابق پہنچ جائے۔ اگر عظیم دھماکہ ہونا ہی ہے تو اسے ہو لینے دیں۔ کنفیوشس کا تو یہی کہنا ہے۔ موجودہ ڈراؤنے خواب کا ہیجان بغیر کسی اخراج و تحلیل کے ہے۔ جو پہیئے بھاری عالمی ڈھانچہ کو روکے یا قائم کئے ہوئے ہیں وہ چَر چَر کر رہے ہیں۔ اب یہ ڈھانچہ نیچے گر پڑے گا۔ عارضی انتظامات کس طرح ایک ایسے ڈھانچہ کو برقرار رکھ سکتے ہیں جس میں ڈھانچہ کے بنیادی نقائص موجود ہوں؟ سرمایہ دارانہ نظام سڑک کے ایک کنارے پر ہے۔ کمیونزم کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور وہ داخلی تنازعات کا شکار ہے۔ تیسری دنیا بڑے بوٹ والے فوجی ڈکٹیٹروں کے لئے فٹ بال کا میدان بن گئی ہے۔ فٹ بال کو اِدھر اُدھر لات ماری جا رہی ہے لیکن گول کہیں نظر نہیں آتا ہے۔ تیسری دنیا کے وہ خطے جہاں آگ بھڑک اٹھنے کا امکان ہے مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ مشرق وسطیٰ

۲۔ وسطی یورپ

۳۔ جنوب مشرقی بحر روم

۴۔ شمال مشرقی ایشیاء

۵۔ افریقہ

جنگ کے شعلے بھڑک اٹھنے کے اس قدر زیادہ امکانات ہیں کہ تیسری جنگ

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

عظیم کسی بھی غیر اہم کونہ سے شروع ہو سکتی ہے۔ چیمپئن پہلے ہی اکھاڑے میں پہنچ چکے ہیں۔ وہ اس وقت نظروں سے اوجھل ہو کر باکسنگ کر رہے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ پہلا مکہ کون مارتا ہے۔ کیا ساری لڑائی میں روایتی قسم کی مکہ بازی ہوگی؟ یہ باکسنگ ایک روایتی لڑائی کی شکل میں شروع ہو سکتی ہے۔ پھر یہ وسیع ہو کر ایٹمی جنگ میں تبدیل ہو سکتی ہے اور اس کا خاتمہ ایٹمی اسلحہ کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے۔ ایٹمی اسلحہ کی گنجائش محدود ہے۔ اسی سبب سے بڑی طاقتیں ایٹمی اسلحہ کے بارے میں سمجھوتہ کرنے کی خواہشمند ہیں۔ بڑی طاقتیں باقی دنیا کی تباہی کو کسی بلند پلیٹ فارم سے نہیں دیکھ سکتی ہیں۔ اس سے جزوی طور پر اس امر کی توضیح ہوتی ہے کہ یورپ کے جارح نوجوانوں نے کیوں چھوٹے پیمانہ پر اور قسط وار اپنی خود تباہی کا انتخاب کیا ہے۔ تباہی یا تو قسطوں میں یا پھر ایک ہی وار یا جھٹکے میں آرہی ہے۔ وہ یا تو روایتی ذرائع سے یا ایٹمی ذرائع سے اور یا دونوں ذرائع سے آرہی ہے۔

تم اس کے لئے تیاری کس طرح کر رہی ہو؟ تم اس کے واسطے تیاری نہ تو سرمایہ دارانہ نظام اور نہ ہی کمیونزم کی طرفداری کر کے کر سکتی ہو اور نہ ہی اس کے واسطے تیاری، دونوں بڑی طاقتوں میں سے کسی ایک طاقت کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کر کے کر سکتی ہو بلکہ اس کے واسطے تیاری عوام کے ساتھ روابط قائم کر کے اور ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کر کے کر سکتی ہو۔ ''انسان دس لاکھ ٹن سے بھی زیادہ طاقتور ہے''، تمہیں آخر تک بنی نوع انسان کے وقار، ذاتی احترام اور مساوات کیلئے جدوجہد جاری رکھنی چاہئے۔ ننگے پیر لوگوں کے نقش قدم پر چلو۔ ایک غریب بچہ کے بالوں میں جو جوں ہے وہ تمہارا ہتھیار ہے۔ ایک کاشت کار کی مٹی کی جھونپڑی کی گندی بدبو تمہاری زہریلی گیس ہے۔ عوام کی قوت کا اندازہ بل کی

بنائی ہوئی گہری لکیر سے اور کارخانہ کے نکلتے ہوئے دھوئیں سے لگا سکتی ہو۔نظریہ کا رسم الخط ایک فاقہ زدہ انسان کی چیخوں سے پیدا ہوگا۔

براہ کرم یہ خیال نہ کریں کہ میں نظریاتی رہنما اصول پیش کرنے سے گریز کر رہا ہوں۔ چیئر مین ماؤسی تنگ نے حقائق سے سچائی تلاش کرنے کے تصور کو اجاگر کیا ہے۔ میں تمہاری رہنمائی کر رہا ہوں کہ تم ہمارے معاشرے کے تاریخی حالات کے حقائق سے سچائی کی تلاش کرو اور مسائل کی شناخت کرو۔ مسائل کی صحیح شناخت کے ساتھ ساتھ صحیح حل بھی پیدا ہوگا۔ اور ان بنیادی دستاویزات سے جو میں نے تحریر کی ہیں اور ان تقاریر سے جو میں نے وقتاً فوقتاً کی ہیں (خصوصاً پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کے بعد) ان سے بھی استفادہ کریں۔ ان سے اس قدر تخیل کی عکاسی ہوتی ہے اور اس قدر خیالات ونظریات کا اظہار ہوتا ہے کہ ہمارے ناقدین نے بھی ان کو ''بھٹو ازم'' کا نام دیا ہے۔ میں اس قدر بڑھ چڑھ کر دعویٰ نہیں کروں گا۔ تاہم میں یہ تسلیم کروں گا کہ وہ خیالات ونظریات دیسی نوعیت کے ہیں حالانکہ وہ اسلامی تاریخ کے تناظر کے اندر ہیں اور جدید حالات وواقعات سے عبارت ہیں جنہوں نے دنیا کو ہلا ڈالا ہے۔ میں ایسا فرد نہیں ہوں جو تانگہ کی پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا ہو جبکہ گھوڑا آگے کی طرف جا رہا ہو اور میں سارے سفر کے دوران پیچھے ہی کی طرف دیکھتا رہوں۔ خوفزدہ نہ ہوں۔ ہمت کا زوال تہذیب کے زوال کی پہلی علامت ہے۔ تم صحیح قسم کے اسلحہ اور نظریات سے پوری طرح مسلح ہوگی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تمہاری رہنمائی کرے گا۔ وہی مالک اور خالق ہے۔

اس سے پہلے میں نے تمہیں بہت زیادہ عملی مطمح نظر یا عملیت کے نظریہ کے بارے میں متنبہ کیا ہے۔ اب میں تمہیں بہت زیادہ عوامی مقبولیت کے نظریہ سے محتاط

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

رہنے کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ کبھی کبھی ایک مقبول فیصلہ بالآخر عوام کے لئے مفید نہیں ہوا کرتا ہے۔ نہ تو عملیت کا نظریہ اور نہ ہی عوامی مقبولیت کا نظریہ بنیادی سیاسی اور سماجی واقتصادی اصول ہیں اور نہ ہی میں یہ کہتا ہوں کہ تم انہیں آزماؤ۔ میں نے اذیت کی حالت میں یہ افسردہ قسم کا تجزیہ کیا ہے۔ جیل کی فضاء نے میری غیر جانبداری کو متاثر نہیں کیا ہے۔ میں یہ نہیں دیکھنا چاہتا کہ چونکہ میں موت کی کوٹھری میں ہوں اس لئے ساری دنیا موت کی کوٹھری میں ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہائی کورٹ نے ساری دنیا کو موت کی سزا سنادی ہے اس لئے کہ اس نے مجھے موت کی سزا سنائی ہے۔ میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ خوش قسمت انسان تصور کروں گا اگر بنی نوع انسان کے تاریک موسم سرما میں دھوپ کی کرن پھوٹ پڑے اور رنگ برنگ کے پھول کھل جائیں۔ دنیا تو بہت خوبصورت ہے۔ ''ایک خوبصورت شے تو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مسرت وشادمانی کا باعث ہوا کرتی ہے۔'' سطح مرتفع کی خوبصورتی ہے۔ بلند و بالا پہاڑوں کی خوبصورتی ہے۔ ہرے بھرے میدانوں کا حسن ہے۔ غیر ہموار ریگستانوں کا اپنا حسن ہے۔ پھولوں اور جنگلات کا حسن ہے۔ نیلے سمندروں اور بل کھاتے ہوئے دریاؤں کا حسن ہے۔ طرز تعمیر کی شان وشوکت ہے۔ موسیقی کی شان وشوکت ہے اور رقص کی چمک دمک کا حسن ہے۔ سب سے بڑھ کر تو مرد اور عورت کا اپنا حسن ہے جو اللہ تعالیٰ کی مکمل تخلیق ہیں۔

میں شیلی کے وجودیت کے نظریہ کی حمایت کرتا ہوں۔ حسن ہر جگہ ہے۔ ایک مکمل تباہی والی جنگ میں بھی حسن کو بالکل ملیا میٹ کر دینا ممکن نہیں ہوگا۔ حسن اس قدر زیادہ حسن ہے کہ وہ بالکل ختم نہیں ہوسکتا۔ اس قید تنہائی کے بارہ مہینوں میں مَیں نے ماضی کا کوئی ناخوشگوار منظر مشکل سے ہی یاد کیا ہے۔ جب میں اس قید خانہ کی

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

دیواروں کو گھنٹوں تک دیکھتا رہتا ہوں تو ماضی کے بہت سے واقعات میرے ذہن میں آتے ہیں۔ ماضی کے کچھ مناظر از سر نو نظروں کے سامنے آئے ہیں۔ جو کبھی بھی میری نظروں کے سامنے دوبارہ نہیں آتے ،اگر میں یہاں مقید نہ کیا جاتا، میں نے بار بار اپنے بچپن کے زمانہ کو جو میں نے گڑھی خدا بخش میں گزارا تھا۔ ان برسوں کو جو میں نے بمبئی میں اسکول میں گزارے اوران آب وتاب والے برسوں کو جو میں نے برکلے اور آکسفورڈ میں گزارے یاد کیا ہے۔ آگرہ کے تاج محل کی شاہانہ شان و شوکت بار بار میرے ذہن میں آتی ہے۔ اسی طرح مجھے وہ پرسکون دن یاد آتے ہیں جو میں نے سری نگر، گلمرگ اور پہلگام میں گزارے تھے۔ وادیٔ کشمیر حیرت انگیز طور پر خوبصورت ہے۔ اپنے طور پر یورپ کا حسن عدیم النظیر ہے، کوئی شخص بھی اس طمانیت قلب کو نہیں بھول سکتا جو کرائسٹ چرچ کے سبزہ زاروں میں چہل قدمی کر کے حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی فرد کیلی فورنیا میں ساحل سمندر پر کارمل کی طلسماتی کشش کو فراموش کرسکتا ہے۔

زندگی محبت کا ملہ ہے۔ نیچر کی ہر خوبصورتی کے ساتھ اظہارِ عشق کیا جاتا ہے مجھے یہ کہنے میں کوئی پس وپیش نہیں ہے کہ میرا سب سے زیادہ جذباتی عشق اور جذبات خیز یا جسم میں جھرجھری پیدا کر دینے والا رومانس عوام کے ساتھ رہا ہے۔ سیاست اور عوام کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والی شادی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''آدمی ایک سیاسی جانور'' ہے اور ریاست یا مملکت ایک سیاسی تھیٹر ہے۔ میں بیس سال سے زائد ہنگامہ خیز برسوں سے اس سیاسی اسٹیج پر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مجھے اب بھی کوئی رول ادا کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ لوگ اب بھی چاہتے ہیں کہ میں سیاست کے اسٹیج پر ہوں۔ لیکن اگر مجبوراً مجھے سیاسی اسٹیج سے علیحدہ رہنا پڑا تو میں تمہیں اپنے

 Copyright © www.bhutto.org

احساسات کا تحفہ دیتا ہوں۔ میرے مقابلہ میں تم زیادہ بہتر طور پر یہ جنگ لڑ سکو گی۔ تمہاری تقاریر میری تقاریر کے مقابلہ میں زیادہ فصیح و بلیغ ہوں گی۔ عوام کے ساتھ تمہاری وابستگی مساوی طور پر مکمل ہوگی۔ تمہاری جدوجہد میں زیادہ توانائی اور جوانی کا جوش ہوگا۔ تمہارے اقدامات زیادہ جرأت مندانہ ہوں گے۔ میں اس انتہائی مقدس مشن کی برکتیں تمہیں منتقل کرتا ہوں۔ صرف یہی تحفہ میں تمہیں تمہاری پیدائش کی سالگرہ پر دے سکتا ہوں۔

یہ تو خراب سیاست ہوگی اگر ایسی صورت کو جو متحرک نوعیت کی ہے اس کی اہمیت کو کم کر کے پیش کیا جائے۔ بنی نوع انسان پر اور اس کے مشن پر یقین رکھیں۔ اللہ جو خالق ہے وہ ساری بنی نوع انسان کا اللہ ہے۔ اللہ ہی قادر مطلق ہے، اس دنیا اور اس کے بعد کی دنیا کے خالق نے خود ہی اپنے اوپر مہربانی کرنے اور معاف کرنے کا فرض عائد کیا ہے۔ کوئی بھی فوجی ڈکٹیٹر اپنے اوپر اس قسم کا فرض عائد کرنے کا اہل نہیں ہے۔ اس کے برعکس وہ تو یہ فضول شیخی بگھارتا ہے کہ وہ کسی کو بھی جوابدہ نہیں ہے۔

افریقہ پاگلوں یا خرد ماغ لوگوں سے نجات حاصل کر لے گا۔ افریقہ یہ ثابت کرنے کیلئے زندہ رہے گا کہ سیاہ رنگ بھی خوبصورت ہوا کرتا ہے۔ افریقہ قدیم ہے لیکن ایشیاء تو سدا جوان ہے۔ اس کے بانکپن والے حسن نے تو بنی نوع انسان کی پیدائش کے وقت سے ہی تہذیب کو چار چاند لگائے ہیں۔ لاطینی امریکہ ایک ایسے بین الاقوامی کلچر کی کھڑتال بن گیا ہے جو اندالوسیا کو عرب سے اور کیریبین سے منسلک کرتی ہے۔ اس کے شعلہ کی لو میں کس قدر حسن ہے۔ یورپ آب و تاب والا اور محبت کئے جانے کے قابل ہے۔ وہ کئی بار چہرے کو خوبصورت اور پرکشش بنوانے

Copyright © www.bhutto.org

کے باوجود اب بھی دلکش اور خوبصورت ہے۔ امریکہ کے بحری ساحل پر رکاوٹیں کھڑی کردی گئی ہیں۔اس کے رکے ہوئے پانی کے بہاؤ میں اس کے حسن کی عکاسی ہوتی ہے۔فضائی اصطلاح میں تو ساری دنیا خوبصورت ہے۔طبیعاتی معنیٰ میں میں نے شاذ و نادر ہی اس سے زیادہ مناظر کی خوبصورتی دیکھی ہے جیسی کہ میں نے کیلی فورنیا اور ٹیکساس میں دیکھی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ اس سب سے زیادہ طاقتور معاشرہ یا ملک کی اندھی قوت اس خوبصورتی کو ایسی بری شکل میں تبدیل کررہی ہے جیسی کہ ڈورین گرے کی تصویر ہے۔

مذہب اللہ اور بندے کے درمیان اور انسان اور انسان کے درمیان ایک کڑی یا رابطہ ہے۔ سیاسی نظریہ انسان اور انسان کے درمیان ایک کڑی یا رابطہ ہے۔اسی سبب سے ہندومت، بودھ مت، یہودیت، نصرانیت اور اسلام جیسے دنیا کے بڑے مذاہب سیاسی نظریات کے مقابلہ میں زیادہ دیرپا ثابت ہوئے ہیں۔اگر کوئی کم علم مہم جو سیاسی اقتدار کی خواہش کے تحت اور اپنے اقتدار کو قائم و دائم رکھنے کی غرض سے مذہب کو اس کی آفاقی سطح سے گرا کر دنیاوی یا مادی سطح پر لے آتا ہے اور اسے ایک تنگ نظر سیاسی نظریہ میں تبدیل کردیتا ہے تو وہ مہم جو اللہ اور بندے کے درمیان اور انسان اور انسان کے درمیان کی کڑی یا تعلق کو خطرہ میں ڈال دیتا ہے۔

چار معاملات ہیں جن کے ذکر کے ساتھ ہی میں اس خط کو ختم کرنا چاہوں گا:۔

۱۔ جب میں نے تمہاری والدہ کے ساتھ ستمبر ۱۹۵۱ء میں شادی کی تھی تو میں ہنی مون منانے کیلئے انہیں استنبول لے گیا تھا۔استنبول ایک خوبصورت شہر ہے۔ یہ مشرق و مغرب کے درمیان ایک پل ہے۔تاہم میں انہیں استنبول اس لئے لے گیا

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

تھا کہ میں ان کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اسلامی تاریخ کے سنہرے اور سب سے زیادہ جرأت مند بابوں یا ادوار کے کاریڈوروں میں سے ہو کر گزروں۔ اسلام کی تاریخ جذبات میں تموج پیدا کرنے والی ہے لیکن جس قدر وہ ترکی میں متواتر حیثیت سے جذبات میں تموج پیدا کرتی ہے اس قدر کسی اور ملک میں نہیں کرتی۔

۲۔ جوانی کے زمانہ سے ہی میں برطانوی سامراجیت کے خلاف جنگ کرتا رہا ہوں۔ مجھے سامراجیت سے سخت نفرت ہے لیکن جب میں ان ذلت آمیز یا تذلیل کن دنوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے اندر کوئی تلخی باقی نہیں ہے اب وہ دور ایک بند باب کی طرح ہے۔ تم ماضی کی جدوجہد کی یاد میں تو زندگی نہیں گزار سکتی ہو، جب تم مکمل طور پر حال کی جدوجہد میں مصروف ہو۔

۳۔ ۱۵ جون ۱۹۷۸ء کو جنرل شوکت مجھے دیکھنے کیلئے آئے اس لئے کہ میں بیمار تھا۔ انہوں نے سول اور ملٹری ہاسپٹل راولپنڈی میں میرا آپریشن ۱۹۶۳ء میں کیا تھا جب میں وزیر خارجہ تھا۔ ہمیں یاد تھا کہ جب میں کلوروفارم کے اثر سے مغلوب ہوتا جا رہا تھا تو میں بار بار کہتا جا رہا تھا کہ میں اکبر بگٹی کو حکومت کے ہاتھوں موت کی سزا نہیں ہونے دوں گا۔ میں اکبر بگٹی اور خیر بخش مری کے نام پکارتا رہا۔ تاریخی واقعات کا گھروندا کس قدر عجیب ہے؟ ۱۹۷۳ء میں پاکستان کے صدر کی حیثیت سے میری پاکستان کی خاطر ان ہی بلوچ لیڈروں سے محاذ آرائی ہوئی۔ اگر اتفاق سے تمہاری ملاقات ان لیڈروں سے ہو جائے تو ان سے کہنا کہ مجھے اس بات پر یقین ہے کہ ایک بلوچ ایک بہادر باپ کا بیٹا اور ایک ایسی ماں کا بیٹا ہوتا ہے جس کو اپنے اوپر فخر ہوتا ہے۔ بہادری اور فخر دونوں ہی بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس کے چہرے سے نمایاں ہوتے ہیں۔

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

۴۔ ۱۹۵۷ء کے موسم سرما میں جب تم چار سال کی تھیں تو ہم "المرتضیٰ" کے بلند چبوترے پر بیٹھے ہوئے تھے صبح کے وقت موسم بڑا خوشگوار تھا۔ میرے ہاتھ میں دو نالی بندوق تھی۔ ایک بیرل ۲۲ء اور دوسرا ۴۸۰ء کا تھا۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے ایک جنگلی طوطا مار گرایا۔ جب طوطا چبوترے کے قریب آ کر گرا تو تم نے چیخ ماری۔ تم نے اسے اپنی موجودگی میں دفن کرایا۔ تم برابر چیختی رہیں۔ تم نے کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا۔ ایک مردہ طوطے نے ۱۹۵۷ء کے موسم سرما میں لاڑکانہ میں ایک چھوٹی سی لڑکی کو رلا دیا تھا۔ ۲۱ سال بعد وہ چھوٹی سی لڑکی ایک نوجوان لڑکی بن گئی ہے جس کے اعصاب فولادی ہیں اور جو ظلم کی طویل ترین رات کی دہشت کا بہادری سے مقابلہ کر رہی ہے۔ حقیقتاً تم نے بلا شبہ یہ ثابت کر دیا ہے کہ بہادر سپاہیوں کا خون تمہاری رگوں میں موجزن ہے۔

میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ کمزوریوں سے پُر ہے۔ میں بارہ مہینے سے قید تنہائی میں ہوں اور تین مہینے سے موت کی کوٹھری میں ہوں اور تمام سہولتوں سے محروم ہوں۔ میں نے اس خط کا کافی حصہ نا قابل برداشت گرمی میں اپنی ران پر کاغذ کو رکھ کر لکھا ہے۔ میرے پاس حوالے دینے کا کوئی مواد یا لائبریری نہیں ہے۔ میں نے نیلا آسمان بھی شاذ و نادر ہی دیکھا ہے۔ حوالہ جات ان چند کتابوں سے لئے گئے ہیں جن کو پڑھنے کی مجھے اجازت تھی اور ان اخبارات و رسائل سے لئے گئے ہیں جو تم یا تمہاری والدہ اس دم گھوٹنے والی کوٹھری میں مجھ سے ہفتہ میں ایک بار ملاقات کرتے وقت ساتھ لے کر آتی ہو۔ میں اپنی خامیوں کیلئے بہانے نہیں تراش رہا ہوں لیکن اس قسم کے جسمانی اور ذہنی حالات میں گرتی ہوئی یادداشت پر بھروسہ کرنا بہت مشکل ہوا کرتا ہے۔

میں پچاس سال کا ہوں اور تمہاری عمر میری عمر سے نصف ہے۔ جس وقت تک

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org

تم میری عمر کو پہنچو گی تمہیں عوام کیلئے اس سے دوگنی کامیابی حاصل کرنی چاہئے جس قدر کہ میں نے ان کیلئے حاصل کی ہے۔ میر غلام مرتضٰی جو میرا بیٹا اور وارث ہے وہ میرے ساتھ نہیں ہے اور نہ ہی شاہنواز اور صنم میرے ساتھ ہیں۔ میرے ورثہ کے حصہ کے طور پر اس پیغام میں ان کو بھی شریک کیا جائے۔ میر سائیں رابرٹ کینیڈی کے بیٹے کا قریبی دوست ہے۔

''ہر نسل کا اپنا مرکزی مسئلہ ہوا کرتا ہے کہ آیا جنگ کو ختم کرنا ہے۔ نسلی ناانصافی کو مٹانا ہے یا کارکنوں کی حالت کو بہتر بنانا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کل کے نوجوانوں کو انفرادی انسان کے وقار کی فکر ہے اور وہ ضرورت سے زائد اختیار اور طاقت کی حد بندی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ ایسی حکومت چاہتے ہیں جو اپنے شہریوں سے براہ راست اور دیانتداری کے ساتھ بات کرے۔ امکانات تو بہت زیادہ ہیں داؤ پر بہت کچھ لگا ہوا ہے۔ میں آنے والی نسل کے لئے ٹینی سن کا مایوس کن لیکن ایک طرح سے پیغمبرانہ پیغام چھوڑتا ہوں کہ'' ارے پچاس سال کی عمر میں مَیں کیسا ہو جاؤں گا اگر قدرت نے مجھے زندہ رکھا جبکہ اس پچیس سال ہی کی عمر میں مَیں دنیا کو اس قدر تلخ پاتا ہوں۔''

ذوالفقار علی بھٹو

ڈسٹرکٹ جیل۔ راولپنڈی

۲۱ جون ۱۹۷۸ء

KENAD DFP -29-11-2008-1000

میری سب سے پیاری بیٹی Copyright © www.bhutto.org